

آخری خواہش

اشتیاق احمد

آخری خواہش



Pakistanipoint

Learn Courses



محسود فاروق، قرآنہ اور انیسویں صدی

آخری خواہش

اشتیاق احمد

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں

پہلا اول : جنوری ۱۹۹۳ء

سمیع : ڈاک پبلشرز پرائیویٹ لاہور

انٹرنیشنل : امریکہ ایسٹارڈ راجہ جگ

~~پبلشرز~~ : ~~پبلشرز~~

مکتبہ اشتیاقی لاجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

دو باتیں

اس ناول 'آخری خواہش' کو آپ میرے تقریباً تمام ناولوں سے مختلف پائیں گے۔ مختلف نہ پایا تو میری رائے آپ کی رائے سے مختلف ہو جائے گی۔ دراصل اختلاف کا یہ پکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آپ بھی اس سے اختلاف نہیں کریں گے۔ چلیے یہ لکھ دیتا ہوں کہ اگر ناول مختلف نہ محسوس ہوا تو بھی اپنی دل چسپی اور قدم قدم پر حالات کی کروٹ آپ کو اپنے میں جذب کرے گی۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ آپ کو ڈھونڈتے رہ جائیں۔ کیونکہ یہ جذب کی کیفیت بھی عجیب ہوتی ہے۔ خدا آپ کو جذبِ صادق عطا فرمائے، آمین !

بات دُور چلی گئی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دو باتیں دُور چلی گئیں؛ حالانکہ ان کے دُور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا اور ناولوں کا توپولی دامن کا ساتھ ہے، جیسے آپ کا اور ناولوں کا یا میرے ناولوں کے کرداروں کا اور آپ کا۔ یہی ہے، اب پتلی دامن کا چرخہ چلی پڑا؛ لہذا ہر قسم کا چرخہ بند اور ناول شروع —

ترتیب

کراچی کے بعد ملتان سے نقلی اشتیاق احمد کا جنم —
 خبر آتی ہے کہ اب ملتان میں ایک نقلی اشتیاق احمد نے جنم لیا
 ہے اور میرے نام کا سہارے کرنا دل بازار میں پہنچانے کا پروگرام
 بنایا ہے۔ کراچی کے نقلی اشتیاق احمد آپ کے بھرپور تعاون سے
 ناکامی اور گنتی کے اندھیروں میں کھو گئے۔ اب ان کی باری ہے۔
 کتاب خریدنے سے پہلے میری تصویر مکتبہ اشتیاق کا مکمل پتا اور ناول
 کا نام اچھی طرح دیکھ لیجیے۔ وہی اپنی اپنی پکیٹ وصول کرنے سے
 پہلے مکتبہ اشتیاق راجپوت، لادکیٹ اردو بازار کی چٹ دیکھ لیجیے۔
 اس چٹ کے بغیر کوئی پکیٹ وصول نہ کریں، وہ نقلی ہو گا۔

آپ کا
 اشتیاق احمد

چھٹی حس

انسپکٹر جمشید کے فون کی گھنٹی بجی — انہوں نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے ریسپور اٹھایا :

”ہیلو، انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔“

”اسلام علیکم جناب، میں پرنسٹنٹ جیل روٹ پارکچہ بول رہا ہوں۔ ایک قیدی کو صبح پچاسی کی سزا دی جانے والی ہے۔ آج جب اس سے آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے کہا — میری خواہش یہ ہے کہ انسپکٹر جمشید سے ملاقات کروں گا۔ اس کا نام منصور ساجد ہے۔“

”لیکن وہ مجھ سے کیوں ملاقات کرنا چاہتا ہے؟“ انسپکٹر جمشید نے حیرت بھرے لہجے میں کہا، کیونکہ وہ منصور ساجد نامی کسی آدمی کو نہیں جانتے تھے۔

”اُس نے وجہ نہیں بتائی — اس کا کہنا ہے کہ اگر میری یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں تو کر دیں۔“

”اچھی بات ہے، میں ایک ایسے آدمی سے ملاقات ضرور کروں گا۔“

جس کی زندگی کا چراغ کل بجھ جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے افسوس زدہ
 لہجے میں کہا، "پھر فوراً ہی بولے :

"میں اس سے کس وقت ملاقات کر سکتا ہوں۔"

"آج رات آٹھ بجے سے پہلے پہلے کسی وقت بھی آپ آ سکتے ہیں۔"

میں بھی آپ کو یہیں ملوں گا۔"

"تو پھر میں اسی وقت آ رہا ہوں۔"

"بہت بہتر" میں آپ کا انتظار کروں گا۔" روت پارکھ نے کہا اور
 انہوں نے ریسپور دکھ دیا۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور نگیم جمشید کی نظریں اُن
 پر جمی تھیں۔ انہوں نے ساری بات دہرا دی۔

"بصرت ہے، وہ آپ سے کیا کہنا چاہتا ہے؟" فرزانہ بولی۔

"یہ کہ وہ بے گناہ ہے اور کسی طرح اُسے پھانسی سے بچایا جائے۔"

لیکن ظاہر ہے اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر ملاقات کے لیے جانے کی کیا ضرورت ہے؟" فاروق نے

کہا۔

"اس لیے کہ یہ اس شخص کی آخری خواہش ہے۔ شاید اس طرح

اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔"

"تو پھر میں بھی ساتھ لے چلیے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں ایک ایسے

شخص کی کیا حالت ہوتی ہے، جسے یہ معلوم ہے کہ صبح اُسے پھانسی دے

دی جائے گی۔" محمود نے کہا۔

”اگرچہ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا، لیکن خیر، تم بھی چلو“ وہ بولے۔

”اے جان، میری درخواست ہے کہ آپ وہاں نہ ہی جائیں۔“ فاروق نے نئی کہی۔

”کیوں، کیا بات ہے؟“

”میری چھٹی حس پکار پکار کر جھ سے کہہ رہی ہے کہ وہاں جانے میں خطرہ ہے۔“ فاروق نے پریشان آواز میں کہا۔

”لا حول ولا قوۃ، بھلا جیل میں ایک ایسے قیدی سے ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے، جسے صبح چھانسی دی جانے والی ہے۔“ فرزانہ نے برا سامنے بنایا۔

”خیر، تمہیں پتا چل چلے گا کہ میری چھٹی حس کہاں تک درست تھی۔“ فاروق نے کسی قدر تھکا کر کہا۔

”دیکھو بھئی، بات یہ ہے کہ مجھے تو جانا ہی پڑے گا، کیونکہ کسی

کی آخری خواہش پوری کرنے کا مسئلہ ہے، تم تینوں بے شک نہ جاؤ۔“

”میں تو ضرور جاؤں گی۔“ فاروق کو اگر ڈر لگ رہا ہے تو بڑے

شوق سے نہ جاتے۔

”میرا فیصلہ بھی یہی ہے۔“ محمود نے کہا۔

”میں بھی چلوں گا۔ سب کا ساتھ دینا ضروری ہے، لیکن جہاں تک میری چھٹی حس کے خیردار کوئے کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ بالکل درست

ہے۔
”پیلو پھر اٹھو۔“

تیار ہونے کے بعد وہ جیپ میں جیل کی طرف روانہ ہو گئے۔
پرنسٹن جیل روٹ پارکھ سے وہ پہلے کبھی نہیں ملے تھے۔ اُس
نے اپنے ’دفتر میں کرسی سے اٹھ کر استقبال کیا۔“ ایک درمیانے قد
کا موٹا سا آدمی تھا۔

”مجھے حیرت ہے،“ قیدی آپ سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔“ عدلیک
سلیک کے بعد اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”حیرت تو جناب میں بھی ہے۔“ خیر، معلوم ہو جاتا ہے۔“
روٹ پارکھ انہیں ساتھ لے کر جیل کے اندرونی حصے کی طرف
روانہ ہوا۔ سوچ عزوب ہونے کے قریب تھا۔ جب وہ قیدی کی کوٹھری
کے سامنے پہنچے تو سوچ کی الوداعی کمر میں جیل کے برج پر چل رہی تھیں۔
انہوں نے دیکھا، کوٹھری میں ایک نوجوان آدمی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا
تھا۔

”مسٹر منصور صاحب،“ انیسٹر جیشید تشریف لے گئے ہیں۔“

قیدی نے فوراً سر اُپر اٹھایا۔ دوازے کی طرف دیکھا اور پھر
بڑی مشکل سے اٹھ کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا۔ شاید اس کی ٹانگوں
سے جان ہی نکل گئی تھی۔ پھر ایک ایک قدم اٹھاتا ساتھ خوں تک آیا۔ پہلے
پھٹی پھٹی آنکھوں سے انیسٹر جیشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کو دیکھتا رہا، پھر

تھر تھر کا ہنسی آواز میں بولا :

”تم۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں، آپ مجھ غریب کے لیے یہاں تک آئے۔“

”کوئی بات نہیں بھئی، لیکن سوال یہ ہے کہ تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ تم مجھ سے کیوں ملاقات کرنا چاہتے ہو؟“ انیسٹر جمشید بولے۔

”میں کھڑے وہ کر بات نہیں کر سکتا۔ میری ٹانگوں سے جان نکل گئی ہے اور بات کرنے میں کچھ دیر تو لگ ہی جائے گی۔“

انیسٹر جمشید نے روٹ پارکچہ کی طرف دیکھا۔ وہ ان کا مطلب سمجھ گئے۔ انہوں نے چوکیدار کو اشارہ کیا۔ اس نے تالا کھول دیا اور منصور صاحب کو سہانا دے کر کوٹھڑی سے باہر لے آیا۔ اب وہ سب روٹ پارکچہ کے دفتر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ منصور صاحب کو دفتر کی ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ انیسٹر جمشید احمد دوسرے اس کے آس پاس بیٹھ گئے۔

”ہاں مسٹر منصور صاحب، اب کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”میں ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور جانتا ہوں، میری بات پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں، کل میرے چانسی پا جانے کے بعد میرا ایک کام ضرور کریں۔“

”تم فکر نہ کرو۔ بتاؤ کیا کام ہے۔ اگر میرے امکان میں ہوا تو ضرور کروں گا۔“

”جو موت میرا مقدر بن چکی ہے، میں اُسے نہیں مار سکتا۔ میں

آپ سے یہ درخواست نہیں کروں گا کہ آپ مجھے پھانسی سے بچانے کی
کوشش کریں، کیونکہ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ عدالت مجھے پھانسی کی
سزا دے چکی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں، میرے مرنے کے بعد آپ میرے
کیس کی نئے سہے سے تفتیش کریں اور دنیا کو یہ بتادیں کہ فساد
تاریخ کو پھانسی پانے والا منظور ماہند قاتل نہیں تھا۔

”قاتل، تم قتل کے جرم میں پھانسی پا رہے ہو۔“

”جی ہاں انسپکٹر صاحب، اس شخص نے اس خریشتہ سیرت انسان کو

قتل کیا ہے، جس نے اسے اس کے ماں باپ کے مرنے کے بعد پالا
پوسا، جوان کیا، مکھایا پڑھایا اور ساری عمر عیش کی زندگی بسر کرائی۔

اس سے زیادہ ظالم اور کون ہو گا۔ تمام شہادتیں اور واقعات اس
کے خلاف ہیں۔ اس کے کیس میں دکیوں اور جج صاحبان کو ایک فیصد

بھی شبہ نہیں۔ یہاں تک کہ خود اس کے وکیل کو بھی اس کے قاتل
ہونے کا یقین تھا۔“ روٹ پارکچہ نے نفرت سے بھرپور انمازیں کیا۔

”یہی تو میری سب سے بڑی بد قسمتی ہے پرنسٹنٹ صاحب،

اور پھر میں یہ خواہش کب کر رہا ہوں کہ مجھے کسی طرح پھانسی سے بچا
لیا جائے، میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے پھانسی پانے کے بعد تفتیش

کی جائے۔“

”لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟ روٹ پارکچہ نے تنک کر

کہا۔

”مجھے نہیں شاید مجھ جیسے کسی دوسرے شخص کو فائدہ ہو جائے اور وہ بے گناہ پھانسی سے بچ جائے۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو، صاف صاف کہو۔ انسپکٹر جمشید بولے۔“

”یہ کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ میں بالکل بے گناہ ہوں اور

مجھے پھانسی دی جا رہی ہے۔“

”پھانسی میں کتنا وقت ہے جناب۔“

”صبح چار بجے دی جائے گی۔“ روت پارکھ بولے۔

”گو یا ابھی تقریباً گیارہ گھنٹے باقی ہیں، نوجوان میری آنکھوں میں

دیکھو۔ انسپکٹر جمشید نے عجیب سے انداز میں کہا۔“

منصور صاحب نے ان کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر جمشید نے اسکی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر کہا :

”کیا واقعی تم نے قتل نہیں کیا ؟“

”نہیں خدا کی قسم نہیں۔“

”تب پھر سنو، میرے پاس گیارہ گھنٹے ہیں، میں اس کیس پر

کام شروع کیے دیتا ہوں۔ اگر تم قاتل نہیں ہو تو پھر خدا سے دعا

کرو کہ ان گیارہ گھنٹوں میں میں قاتل تک پہنچ جاؤں۔ اگر میں اس

میں کامیاب نہ ہو سکا تو پھر تم پھانسی پا جاؤ گے۔ لیکن میں وعدہ

کرتا ہوں کہ کیس پر اس کے بعد بھی کام جاری رکھوں گا۔“

”بس، میں یہی چاہتا ہوں۔“ نوجوان کے چہرے پر حسرت زدہ سی مسکراہٹ رنگد گئی۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

”لیکن تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تم نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیوں کیا ہے؟“

”میں آپ کے بارے میں بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔“

”تب پھر تم نے کیس کے دوران میری مدد کیوں حاصل نہیں کی؟“

”میں نے اپنے وکیل سے کہا تھا، لیکن اس نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس نے کہا تھا کہ اس طرح کیس خراب ہو جائے گا۔“

”ہوں، اپنے وکیل کا نام بتاؤ۔ یہ بھی کہ تم کس کے قتل کے جرم میں اس سزا کو پہنچے ہو۔“

”میرے وکیل کا نام رائا امانت علی ہے اور میں احسان تابش صاحب کے گھر میں پلا بڑھا ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے پالا پوسا۔ اپنے ماں باپ تو مجھے یاد بھی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے گھر کا پتا کھرایا، وکیل کے فون نمبر بھی بتائے۔ محمود ساتھ ساتھ نوٹ کر رہا تھا۔

”تھانے کا نام؟“

”تھانہ شباب آباد۔“

”بس اب میں فوراً روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ خدا کو یاد کرو۔“

الشیکم جشید بولے۔

”خدا آپ کو ہمیشہ خوشیاں دے۔“ یہ کہتے وقت منصور ساجد

کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسی وقت روف پارکھ نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور وہ منصور صاحب کو سہارا دے کر اٹھائے گیا۔

”انسپکٹر صاحب، وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر پھانسی پانے والا شخص یہی کہتا ہے کہ جرم اس نے نہیں کیا۔“

”لیکن روف پارکھ صاحب، یہ شخص جھوٹ نہیں بولی رہا۔“

”کی مطلب؟“ روف پارکھ چونک اٹھا۔

”میں نے اس کی آنکھوں میں سچ پڑھ لیا ہے۔ یہ تو جو اس وقت قاتل نہیں ہے اور انشاء اللہ چار بجے سے پہلے پہلے میں یہ بات ثابت کر دوں گا۔“

”میرا خیال ہے، آپ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ یہ یاد رہے کہ

میں پھانسی کے اوقات میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ ٹھیک چار بجے اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ۔“

”ٹھیک ہے، اگر میں آپ کے پاس تین بج کر آٹھ منٹ پر

نہ پہنچ سکا تو آپ بے شک اسے پھانسی دے دیجیے گا۔“ انہوں نے پرسکون آواز میں کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔



تھانہ شہاب آباد کے تھانیدار نے انہیں بھاڑ بھاڑ کر دیکھا۔

”دیکھیے جناب، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ بس میں احسانِ تاملش کے قتل کی فائل دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں ابھی لاتا ہوں جناب۔ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔“

جلد ہی وہ فائل لے آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی فائل کی ورق گردانی شروع کر دی۔ محمود، فادوق، فرزانہ بھی ان کے ساتھ بیٹھتے چلے گئے۔ آخر فائل کا مطالعہ مکمل ہو گیا۔ تمام باتیں ان کے ذہنوں میں نقش ہو گئیں۔ اس فائل کی رُو سے تو مشہور ساجد سو فیصد قاتل تھا۔ اور اس کے بے گناہ ثابت ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

”بہت بہت شکریہ جناب۔“ انہوں نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔ اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تھانے سے باہر نکل کر انہوں نے کہا:

”ہمیں احسانِ تاملش کے گھر چلنا ہو گا۔“

محمود نے نوٹ بک میں لکھے ہوئے پتے پر نظر ڈالی اور ایک بار پھر وہ جیب میں لٹا ہوا ہے۔ آندھی اور طوفان کی رفتار سے جیب چلاتے ہوئے احسانِ تاملش کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ کوٹھی بہت شاندار اور بڑی تھی۔ اس میں اندر ہر طرف روشنی ہو رہی تھی جیب کو پھاٹک سے باہر ہی روک کر وہ نیچے اتر آئے کہ نہ جانے کب واپس جانا پڑ جائے اور پھاٹک میں سے نکالنے میں وقت ضائع ہو۔ محمود نے

گھنٹی کا بٹن دبایا۔ فوراً ہی کسی کے تیز تیز قدموں سے پھاٹک کی طرف آنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے سوپے کے پھاٹک کی دلدلی سے ایک نوجوان لڑکی کو آتے دیکھا، پھر پھاٹک کھل گیا۔ انہوں نے دیکھا، یہ اٹھارہ انیس سال کی لڑکی تھی، پتلی موبلی اور بے سے قد کی۔ آنکھیں سیاہ تھیں اور رنگ سفید۔

”فرمائیے“ اس نے کہا۔

”مجھے انٹر میڈیٹ کتنے ہیں۔ یہ میرے بچے محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔ بات ایسی نہیں کہ میں یہاں کھڑے ہو کر بتا سکوں، اس کے لیے آپ کو ہمیں اندر لے جانا ہوگا۔“

”آپ انٹر میڈیٹ ہیں۔“ لڑکی نے انک کو حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے باہر کو اڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

”ہاں، خدا کے لیے جلدی سے ہمیں اندر لے چلیے۔ وقت بہت کم ہے۔“

”کس چیز کا وقت بہت کم ہے؟“ لڑکی کے لہجے میں حیرت اور بڑھ گئی۔

”اوہو! یہ باتیں تو میں اندر چل کر بھی بتا سکتا ہوں۔“

”اچھا آئیے۔“ آخر لڑکی نے کہا اور انہیں سے کڑواٹنگ روم میں آئی۔ یہ ایک بہترین طرز پر سجایا ہوا کمرہ تھا۔ فرش پر جہت

موتا قالین بچا تھا۔ کرسیاں گدے وار تختیں اور صوفوں پر ڈالتی راحت
کا کام کیا گیا تھا۔ درمیان والی میز بھی نقش نگار والی تھی۔

”آپ یہاں تشریف رکھیے۔ اور اب فرمائیے۔“

”گھر کے سب افراد کو یہاں بلا لائیے۔“ انسپکٹر جمشید ہوئے۔

”یا اللہ رحم، خیر تو ہے۔“ ٹکی نے گہرا کر کہا۔

”پہلے سب کو بلا لیں، پھر بتاؤں گا۔“

”اچھا، میں سب کو آپ کا پیغام دیتی ہوں۔“ اس نے کہا۔
تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ گھر کے افراد کی آمد شروع ہو گئی۔
کمرے میں داخل ہونے والے کل پانچ افراد تھے۔ سب سے آگے وہی
ٹرکی تھی، جس نے ان کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس نے اندر داخل
ہوتے ہی کہا:

”ایک شخص نہیں آسکا جناب، وہ اس وقت بخار کی حالت

میں ہے اور وہ ہے کریم بابا۔ اس گھر کا باورچی اور دوسرے کام کاج
کرنے والا۔“

”بہت خوب، گویا باقی سب لوگ یہاں آپہنچے ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”تو پھر سب سے پہلے تعارف ہو جائے۔ میں انسپکٹر جمشید ہوں۔“

یہ میرے نیچے محمود فاروق اور فرزانہ ہیں۔ اب آپ اپنا اپنا تعارف

خود کرایے۔

”لیکن ان سب سے پہلے ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ معاملہ کیا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”معاملے کا بھی ابھی پتا چل جاتا ہے، پہلے تعارف ہو جائے۔

”اچھا خیر، میں رحمان تالیش ہوں۔ اس وقت گھر میں سب

سے ٹہرا میں ہی ہوں۔“

”اور میں روبینہ تالیش، ان کی بیوی۔“ ایک عورت نے کہا۔

”میں یاسمین تمارا ہوں، ان کی بھانجی، میری ماں ونا تالیش کی

ہے اور باپ تو اس سے بھی پہلے مر گیا تھا۔ اس لڑکی نے لاپرواہی سے کہا۔

”میں راحیل اشرف ہوں۔ ان کا بیٹا۔“ ایک نوجوان نے کہا۔

”وہ گیا ہیں۔ میں اس گھر کا ڈرائیور ہوں۔ نام تو میرا یاد نہ

ہے، لیکن سب مجھے راکٹ کہتے ہیں۔ دراصل میں کار بہت تیز چلاتا ہوں۔“

”اور ہمارے علاوہ کہیں باپا ہیں۔ وہ اس گھر کے باورچی ہیں۔

بہتہ پڑانے ملازم ہیں۔ اس وقت بیمار ہیں۔ رحمان تالیش نے کہا۔

”اس گھر کا ایک فرد اور بھی ہے، اس کا نام منصور ساجد ہے۔“

انیکٹر جمشید نے ٹھٹھہ کر کہا۔

”کیا مطلب؟ یہاں اس کا کیا ذکر۔ اس بد بخت کو تو جمع پھانسی

ہونے والی ہے۔

"ہاں، میں جانتا ہوں۔ اسی کی وجہ سے میں یہاں نظر آ رہا ہوں۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے: چنانچہ مجھے یہ اطلاع دی گئی۔ میں جیل میں جا کر اس سے ملا۔ اس کا کہنا ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا۔ اس کے پھانسی پانے کے بعد میں اس کیس کی نئے سرے سے تفتیش کروں، لیکن میں نے اس کے پھانسی پانے سے پہلے ہی تفتیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ میرا بھی یہ خیال ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا، کسی اور نے کیا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ قتل ہونے والی شخصیت کا نام احسان تابش تھا۔ وہ اس گھر کے سب سے بڑے فرد تھے۔ انہوں نے منصور ساجد کو لے کر پالا تھا: گویا ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ رحمان صاحب، آپ مقتول کے سگے بھائی ہیں۔ آپ کے بیٹے راحیل اختر ان کے بھتیجے اور یہ بچی ان کی بھانجی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ احسان تابش ایک بہت بڑی زمین بے شمار نقدی، زلیورات اور اس شاندار کوٹھی کے مالک تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انہیں کسی نے قتل کیا اور کیوں؟ یہاں تک کہ کورسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

مگر میں چند لمحوں کے لیے موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ آخر

رجحان "تائش نے سر اوپر اٹھایا۔

"سوال یہ ہے کہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ منصور ساجد قاتل نہیں ہے، جب کہ تمام شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔ اس کا جرم اتنا مکمل ہے کہ عدالت نے اسے پھانسی کی سزا دی ہے۔ اس کے اپنے وکیل تک کو یہ یقین تھا کہ قاتل اس نے کیا ہے، پھر آپ کس طرح یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ وہ قاتل نہیں ہے اور اب اس بات کے کہنے کا فائدہ بھی کیا۔ چند گھنٹے بعد اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ کمافی ختم ہو جائے گی۔"

"کمافی ختم نہیں ہوگی، جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اصل قاتل کون ہے اور میں یہی معلوم کرنے لگا ہوں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سب لوگ مجھ سے تعاون کریں، جو باتیں میں معلوم کرنا چاہوں، ٹھیک ٹھیک بتا دیں۔ اس میں مجھے کوئی شک نہیں کہ منصور ساجد قاتل نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پورے دو سال تک عدالت میں کیس چلتا رہا۔ وکیل، وچ، پولیس واسے، کیا ان سب کے اندازے غلط تھے۔" ردینہ تائش بولی۔

"اس بات کو پھوڑیے۔ بعض اوقات بالکل بے گناہ آدمی صاف قاتل نظر آتا ہے۔ واقعات کچھ اس طرح پیش آتے ہیں۔ ناں تو آپ ہم سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ دراصل میں چاہتا ہوں

کہ ایک بے گناہ پھانسی پر نہ چڑھے۔

”اگر آپ زبردستی ایک مجرم کو بے گناہ بنا دینا چاہتے ہیں تو

ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں اور پھر سوال تو یہ ہے کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ منصور ساجد قاتل نہیں ہے، تو پھر قاتل کون

ہے؟“ رحمان تابش نے جھلاتے ہوئے بچے میں کہا۔

”یہی تو میں معلوم کرنے آیا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

”کیا مطلب؟“ یاسمین تارا بڑی طرح چونکی۔

”گویا آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہیں۔“ انسپکٹر جمشید مسکرتے۔

”ہاں، آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایک قاتل

ہے۔“ یاسمین تارا نے سسے ہوئے انداز میں کہا۔

”ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں، وہ سب چلا اُٹھے۔ ان کے چہروں پر غوث روڑ گیا۔

”اور میں آپ کو ایک شدید خطرے سے خبردار کر دینا چاہتا

ہوں۔“ انسپکٹر جمشید نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”کیسا خطرہ؟“ کسی آواز میں اُبھر رہی۔

”جس کسی نے احسان تابش کو قتل کیا ہے، وہ بہت جلد کسی

دوسرے کو قتل کرنے کا پروگرام بنائے گا۔“

”یہ آپ کسی طرح کہہ سکتے ہیں؟“

”جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ یہ سازش جابجا، نقدی، زیورات

اور غلیم نشان کو بھی مڑپ کرنے کا منصوبہ ہے۔ وہ بولے۔
 ”غلط بالکل غلط، بھائی جہاں سب کو الگ الگ حصہ دے

گئے ہیں۔“ رحمان تابش نے زور سے انگڑیوں میں سر ہلایا۔
 ”لیکن منصور ساجد کے پھانسی پانے کے بعد اس کا حقہ آخر

اس گھر میں رد ہائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی اور چل بسا تو اس
 کا حقہ بھی باقی ماندہ لوگوں میں تقسیم ہوگا؛ لہذا آپ لوگ اگر ایک
 خوف ناک قاتل نے خود کو بچانا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ بھرپور
 تعاون کریں؛ ورنہ میں یہاں سے اسی وقت ہانے کے لیے تیار ہوں۔
 میری بلا سے۔“

وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ آخر سب سے پہلے یاسمین تارا
 نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا:
 ”میں آپ کے ساتھ ہر طرح تعاون کرنے کو تیار ہوں۔“
 ”اور میں بھی۔“ راحیل اثر فٹ بول پڑا۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر ہم سبھی تعاون کریں گے، لیکن اس
 کے باوجود ہم یہی سمجھتے ہیں کہ قاتل منصور ساجد ہی ہے اور یہ کہ
 آپ گڑے مردے اکھاڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“ رحمان تابش نے
 جملے بچھنے سے باز نہیں کیا۔

”گڑے مردے اکھاڑنا میرا مشغلہ ہے۔ آپ فکر نہ کریں اور اب
 پہلے میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میری معلومات کہاں تک ہیں۔ اچھا

ہوتا کہ کریم بابا کو بھی کسی نہ کسی طرح یہاں لے آیا جاتا۔ اب ہمیں اس سے انگ جا کر سوالات کرتا ہوں گے اور اس طرح وقت ضائع ہو گا اور وقت ہمارے پاس بہت ہی کم ہے۔ یہ ایک شخص کی زندگی کا سوال ہے۔“

”کریم بابا بخار میں جیل رہا ہے۔ اسے کمرے سے نکال کر لایا گیا تو ہوا لگنے کا ڈر ہے۔ وہ پہلے ہی بہت بوڑھا ہے۔ ڈرائیوڈ راکٹ نے کہا۔“

”اچھا خیر! اب ذرا خاموشی سے تفصیل سن لیجیے۔ احسان تائبش کی شادی آج سے تقریباً پچیس سال پہلے ہوئی تھی۔ ان کا گھر انڈیا سے ہی دولت میں کھیلتا تھا۔ شادی کے دو سال بعد ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کی پیدائش کے فوراً بعد ان کی بیوی فوت ہو گئی۔ احسان تائبش مرحوم نے اس بچے کو اہ بن کر پالا، لیکن ابھی وہ دو تین سال کا تھا کہ ایک دن کھیلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا اور سڑک پر عین اس وقت دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔ جب دوسری طرف سے ایک کار اس جگہ سے گزیر رہی تھی اور اس طرح بچہ کار کے نیچے آ گیا۔ کار والے نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ احسان تائبش مرحوم پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ ان کا بُرا حال ہو گیا، یہ بچہ ہی تو ان کی زندگی تھا۔ معاملہ عدالت میں گیا، لیکن چونکہ کار والے کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سڑک پر منتظر دیکھنے والوں نے بھی یہی گواہی دی تھی کہ بچہ بالکل اچانک

سڑک پر آگیا تھا۔ اس لیے عدالت نے کاروائے کو بری کر دیا۔ کار والا احسان تابش کے پاس آکا اور ان سے کہا کہ وہ ان کا مجرم ہے جو سزا دینا چاہیں دے دیں۔ احسان تابش روتے رہے۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ آخر کار والا چلا گیا، لیکن اپنے نام اور پتے کا کارڈ لے گیا تاکہ احسان تابش اپنے مجرم کو سزا دینے کے لیے بلانا چاہیں تو آسانی سے بلا سکیں۔

دن گزرتے گئے۔ احسان تابش صاحب کا غم ہلکا ہوتا گیا۔ پھر ایک دن وہ ایک بچہ کسی سے ملے آئے۔ یہ تقریباً دو سالہ بچہ تھا۔ انہوں نے اس بچے کو پالنا شروع کیا۔ بہت محبت اور شفقت سے اسے پالا، پلوسا، مکھایا، پڑھایا اور وہ اس گھر کا ایک فرد بن کر جوان ہوا۔ یہ نوجوان منصور ساجد تھا۔ اس کے بارے میں احسان تابش صاحب نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اسے کہاں سے لائے تھے۔ سب کا خیال یہ تھا کہ یتیم خانے سے لائے ہوں گے۔ گھر کے افراد نے ان سے پرچھا بھی کہ بچہ انہیں کہاں سے ملا، لیکن انہوں نے اس سوال کا کبھی کسی کو کوئی جواب نہ دیا؛ گویا یہ بات آج تک ایک راز ہے۔ آج سے تقریباً تین سال پہلے یعنی مرنے سے ایک سال پہلے انہوں نے اپنی وصیت لکھوا دی تھی؛ اس وصیت کی رو سے منصور ساجد بھی برابر کا حصہ دار تھا۔ یعنی انہوں نے اپنی تمام دولت گھر کے افراد میں برابر برابر تقسیم کرنے کی وصیت لکھوائی تھی؛ البتہ دونوں ملازموں کو دس دس

ہزاروں مٹے تھے۔ انہوں نے بے پالک بیٹے، بھائی بھتیجے، بھانجی اور بھادڑا
 میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ پانچوں کو برابر حصہ دیا۔ کوٹھی کے بارے میں
 وصیت یہ تھی کہ یہ لوگ اس میں رہ سکتے ہیں۔ اس کے برابر کے مالک
 ہیں، لیکن اسے فروخت نہیں کر سکتے اور وصیت کھلانے کے ٹھیک ایک
 سال بعد انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ انہیں دل کی تکلیف رہنے لگی تھی۔ دو
 بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں نیند نہیں آتی
 تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں نیند لانے والی گولیاں لکھ دی تھیں۔ وہ گولیوں
 کی اس شیشی میں سے ہر روز ایک گولی سوتے وقت کھاتے تھے، لیکن
 جس صبح وہ مردہ پئے، اس روز نیند والی گولیاں آٹھ دس کم ملی تھیں۔
 رات کے وقت دوا کھانا منظور ساجد کا کام تھا۔ وہ انہیں ہر روز دوا
 کھاتا تھا۔ اس روز بھی نیند والی گولی اس نے کھلائی تھی۔ گولیوں
 کی شیشی ابھی دو دن پہلے ہی بازار سے لائی گئی تھی اور اس میں
 پوری پچاس کے قریب گولیاں تھیں۔ ڈاکٹر پہلے ہی یہ بات کہہ چکا تھا
 کہ دو گولیوں سے زائد کھانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ گولیاں
 ایک طرح کا زہر ہیں۔ منظور ساجد کا بیان ہے کہ اس نے اس روز
 رات کو بھی ایک ہی گولی انہیں کھلائی تھی اور اس لحاظ سے شیشی میں
 صبح سینتالیس کے قریب گولیاں ہونی چاہئیں تھیں، جب کہ شیشی میں
 چالیس گولیاں ملی تھیں، گویا احسان تابش کو اکٹھی سات گولیاں کھلا
 دی گئی تھیں، جن سے ان کی موت واقع ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی

رپورٹ نے بھی موت کی وجہ وہ گولیاں بتائی تھیں۔ ان کے خون میں ان گولیوں کا زہر پایا گیا تھا۔ گولیوں کی شنیتھی پر سولے منصور ساجد کے اور کسی کی انجیکشن کے نشانات نہیں پائے گئے۔ بات کو سب سے آخر میں ان کے کمرے میں وہی کیا تھا۔ منصور ساجد کے بعد گھر کا کوئی فرد احسان تابش مرحوم کے کمرے میں نہیں گیا۔ احسان تابش صاحب کی وصیت میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کی موت سے پہلے وصیت پر عمل نہیں کیا جائے۔ وصیت سب کے سامنے دکھائی گئی تھی؛ لہذا پولیس، سرکاری وکیل اور جج صاحبان نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ منصور ساجد اپنے محسن کی موت کا انتظار نہ کر سکا اور اس نے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے انہیں ضرورت سے بہت زیادہ گولیاں کھلا دیں۔ منصور ساجد کے وکیل نے عدالت میں یہ فقط اٹھایا تھا کہ احسان تابش اپنے ہوش و حواس میں تھے، پھر انہوں نے اکٹھی سات گولیاں کیوں کھلی لیں۔ اس کا جواب سرکاری وکیل نے یہ دیا تھا کہ نیند آور گولیوں سے پہلے دل کی تکلیف کی کچھ گولیاں بھی احسان تابش کو روزانہ کھانا ہوتی تھیں؛ چنانچہ منصور ساجد نے اس روز انہیں دوسری گولیوں کی بجائے نیند والی گولیاں بھی کھلا دیں اور آدھ گھنٹے کے وقفے سے نیند کی ایک گولی اور دسے دی۔ اس طرح احسان تابش کو یہ پتا نہ لگ سکا کہ اس نے کونسی گولیاں کھالی ہیں۔ ظاہر ہے کہ گولیاں ایک کاغذ پر رکھ کر سلق میں ڈال دی جاتی ہیں اور اوپر سے پانی پلا دیا جاتا ہے۔ اب

کھانے والے کو یہ کیا پتا کہ اسے کونسی گولیاں کھلائی گئی ہیں۔ وہ منصور ساجد سے بہت محبت کرتے تھے۔ منصور ساجد بھی بظاہر ان پر جان چھڑکتا تھا، لہذا وہ کس طرح یہ شک کر سکتے تھے کہ انہیں نہ ہر کھلایا جا رہا ہے۔ دوسرے دن جب کریم بابا انہیں جگاتے گیا اور بند کمرے کے دروازے پر دستک دی تو انہوں نے دروازہ نہ کھولا۔ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی دروازہ نہ کھلا تو کریم بابا نے شور مچا دیا۔ سب لوگ دروازے پر جمع ہو گئے۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں اور ان میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ باہر سے کچھ نہ دیکھا جا سکا۔ آخر دروازہ توڑا گیا تو وہ اندر مرے پڑے تھے۔ پہلا خیال تو یہ آیا کہ رات میں کسی وقت ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گئے، لیکن ان کے منہ سے آنے والے خون کو دیکھ کر سب گھروالوں کو پریشانی ہوئی۔ آخر پولیس کو قون کیا گیا۔ پولیس نے تفتیش شروع کی اور یہ نتائج سامنے آئے، جو میں نے بتائے ہیں۔ اس کے بعد منصور ساجد کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ گھر کے سبھی افراد نے اسی پر شک کا اظہار کیا۔ شیشی پر بھی اسی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ آخر کیس عدالت میں پہنچا۔ دو سال تک مقدمہ چنارہا۔ یہاں تک کہ کیس مکمل ہوا اور اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے۔ اب صبح اسے پھانسی دی جانے والی ہے۔ یہ تو بہت کل تفصیل جو پولیس فائل سے میں نے پڑھی۔ اب میں اپنی تفتیش شروع کروں گا۔

کیا آپ لوگ ذہنی طور پر تیار ہو چکے ہیں۔“
 یہاں تک کہ کرائسٹمچس فاموش ہو گئے۔ کسی نے ان کے
 جواب میں ہاں یا نہ ہیں کچھ نہ کہا۔ خاموشی کا مطلب یہ تھا کہ وہ
 تیار ہیں اور کرائسٹمچس ان سے سوالات شروع کر سکتے ہیں۔

تفیش شروع

ایک ہمیشہ چند سینڈویک ان سب کو دیکھتے رہے، پھر بولے :

”اگر آپ لوگوں کو کھانا وانا کھانا ہو یا کچھ اور کام ہو تو آپ

ڈرائنگ روم سے جا سکتے ہیں۔ میں سب سے باری باری سوالات کرنا

پسند کروں گا، سب کے سامنے نہیں۔“

”جی ہاں، ابھی یہیں کھانا کھانا ہے۔ اس کے بعد آپ اپنی

کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، آپ لوگ جا سکتے ہیں۔“

”آپ بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائیے نا۔“ یاہن مارنے کا۔

”بہت بہت شکریہ۔ ہم بھی اپنے گھر سے کھانا کھا کر آتے ہیں۔“

زیادہ دیر نہیں جانا پڑے گا۔

”لیکن اس کی ضرورت کیا ہے۔ کھانا تو تیار ہے۔“ رضوان تابش

بولے۔

”میرا آپ اصرار کر رہے ہیں تو کھا لیتے ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ

ہو گا کہ وقت بچے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

کچھ دیر بعد وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کریم بابا کا کھانا اس کے کوارٹر میں ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ راکٹ نے ان کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ اپنا کھانا اپنے کوارٹر میں اٹھالے گیا۔ کھانا سب کے سامنے یا سین تارا اور روبینہ تابش نے دگایا۔ آخر سب کھانے سے فارغ ہوئے۔ اس وقت انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہتر ہو گا کہ آپ لوگ احسان تابش کے وکیل کو بھی بلا لیں، جنہوں نے وصیت کھی تھی۔ شاید وہ اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکیں۔" اچھی بات ہے، میں ابھی فون کرتا ہوں۔" رحمان تابش نے کہا۔ وکیل کا نام رانا امانت علی تھا۔ اسے فون کر دیا گیا۔ انسپکٹر جمشید پھر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ آتے ہوئے انہوں نے رحمان تابش سے کہا:

"آپ دو منٹ بعد ڈرائنگ روم میں آجائیے گا۔"

ڈرائنگ روم میں آکر انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ سے کہا:

"میں ان لوگوں سے سوالات شروع کرتا ہوں، چونکہ وقت بہت

کم ہے، اس لیے تم تینوں کریم بابا کے کمرے میں چلے جاؤ اور اسے سارے

حالات پر سوالات شروع کرو، دیکھو، کوئی تفصیل وہ نہ دے۔ پُراٹنے

حمازم جو معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں پہنچا سکتا۔"

"بہت بہتر آبا جان، آپ فکر نہ کریں، بلکہ آپ کا بہت بہت

شکریہ کہ آپ نے ہمیں بھی کوئی کام سونپا : ورنہ ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اس کنیس میں سوائے ماتھہ پر ماتھہ دھر کر بیٹھ رہنے کے اور گفتگو سننے رہنے کے اور ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ فاروق نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں، جس نے فاروق کی آواز سنائی۔ میرا تو خیال تھا۔ آج فاروق گھر سے اپنے ہونٹ سی کر چھڑا ہوا ہے۔“ فرزانہ نے شوخ ہنسنے میں کہا۔

”غلط کہتی ہو۔ سینے پر رونے کا کام ایس کیا جانوں۔ ہونٹ سینے کا ارادہ ہوتا تو تم سے ہی سوا کر آتا۔“ فاروق بولا۔

”ابا جان، اس سے پہلے کہ یہ دونوں بحث میں اُچھ کر دقت مٹا دیں، کرنا شروع کریں، میں کریم بابا کے کمرے کی طرف روانہ ہو جاتا ہوں۔“ محمود نے کہا اور تیز قدم اٹھاتا نکل گیا۔

”دیکھا فرزانہ، اکیلے اکیلے ہی کام دکھانا چاہتا ہوں، لیکن بھلا ہم کہاں پیچھا چھوڑنے دے؟“ فاروق نے کہا اور خود بھی کمرے سے نکل گیا۔

”یہیچہ چالاک کہیں کے مجھے یہیں پھڑپھڑے بارہے ہیں۔“ فرزانہ نے جھٹکا کر کہا اور اُٹھ کر تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ عین اس وقت رحمان تائیش حیرت زدہ سا اندر داخل ہوا۔

”یہ آپ کے بچوں کو کیا ہوا؟ کہاں بھاگے بارہے ہیں؟“

”کریم بابا کے کمرے کی طرف۔ ان سے سوالات کرنے کی ڈیوٹی ان کی ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”اوہ سمجھا، اچھا جناب، میں حاضر ہوں۔ پوچھیے کیا پوچھنا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں۔ اس ساری کارروائی سے حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں، رات ضرور برباد ہوگی۔“

”ایک شخص کی زندگی بچانے کے لیے کیا ہم ایک رات کا آرام بھی قربان نہیں کر سکتے؟ انسپکٹر جمشید طنز پر بلیچے میں بوسے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ راتیں تو کئی قربان کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ یقین بھی تو ہو کہ ہماری کوشش رنگ لائے گی۔“

”آپ دیکھتے جیسے کیا رنگ لاتی ہے ہماری کوشش۔ اب آپ سے پہلا سوال، آپ سب لوگوں سے احسان تماش صاحب کا سلوک کیسا تھا؟“

”بہت ہی اچھا۔ وہ محبت کا مجسمہ تھے۔ ہر ایک سے برابر کی محبت کرتے تھے۔ سب کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی خواہش کو نہیں ٹھکرایا۔ ہر ایک کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔“

”مقصود ماہد کے ساتھ ان کا سلوک کیسا تھا؟“

”اسے تو وہ سب سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ شاید وہ اسے بہت اس بیٹے کا بدل خیال کرتے تھے، جو حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا اور میں

تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ منصور ساجد کو لے کر ہی اس بیٹے آئے تھے کہ
بہنہ بیٹے کا علم بھول جائیں۔

”اور آپ لوگوں نے ان سے پوچھا بھی کہ وہ اس بچے کو کہاں سے
لائے ہیں، لیکن انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔“

”جی نہیں۔“

”حادثہ کس تاریخ کو ہوا تھا اور وہ بچہ کس تاریخ کو لائے تھے۔
کیا آپ بتا سکتے ہیں۔“

”جی نہیں، بھلا میں یہ کس طرح بتا سکتا ہوں۔ لیکن پولیس

کی رپورٹ سے حادثے کی تاریخ ضرور مل سکتی ہے۔“

”ہول، لیکن مجھے حادثے کی رپورٹ سے زیادہ بچے کے گھر میں

ہونے کی تاریخ کی ضرورت ہے۔ خیر، دیکھا جلتے گا۔ آپ یہ بتائیے کہ

اس شخص کا نام کیا تھا، جس کی کار کے نیچے آکر آپ کے بھائی کا

بچہ ہلاک ہوا تھا۔“

”اس کا نام فیاض سیٹھ تھا۔“

”آپ کو اس کا پتا یاد ہے۔“

”جی نہیں، بھلا مجھے اس کا پتا یاد رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

اگر یہ معلوم ہوتا کہ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی مجھ سے اس کا پتا

پوچھا جائے گا تو ضرور یاد رکھتا۔“ اس نے طنز یہ بھیہ میں کہا۔

”خیر کوئی بات نہیں، یہ بات تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ احسان تابش

مرحوم کی موت سے آپ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔
 ”جی وہ کیسے؟“ دھماکا بلبلیں چوٹا۔

”کل دولت میں سے ایک حصہ تو آپ کو مل گیا، دوسرا حصہ آپ
 کی بیوی کو تیسرا حصہ آپ کے بیٹے راجیل کو۔ آپ کے بعد باقی بچنے
 یا سین تارا اور منصور مابعد، دو حصے انہیں ملے۔ منصور مابعد کو صبح
 اگر پھانسی ہو گئی تو اس کے حصے میں سے بھی تین حصے آپ لوگوں
 کو مل جائیں گے اور ایک حصہ یا سین تارا کو؛ گویا آپ بہت زیادہ
 فائدے میں رہے، تو میں یہ کیوں نہ سمجھوں کہ یہ بات آپ کے ذہن
 میں اس وقت آتی تھی جب احسان صاحب نے اپنی وصیت لکھوائی۔
 کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ منصور مابعد جب آپ کے مرحوم بھائی کے کمرے
 سے نکل آیا تو آپ رات کی تاریکی میں اس کے کمرے میں گئے اور سوتے
 ہیں ان کے منہ میں چھ گویاں ٹھونس دیں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ
 آپ اتنا غلط الزام مجھ پر لگائیں گے، اگر میں نے ایسا کیا ہے تو
 گولیوں کی شیشی پر میری انگلیوں کے نشانات کیوں نہیں ملے۔“

”میں غور کروں گا کہ شیشی پر آپ کی انگلیوں کے نشانات کیوں
 نہیں ملے۔“ انسپکٹر جمیشد نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”اس کی صورت وہ یہ ہے کہ میں نے اس شیشی کو ماتہ لگایا ہی

نہیں۔“

”ہوں، آپ جاسکتے ہیں، شاید پھر آپ کی ضرورت پڑے : مذاکشتیں
 کیجیے گا کہ آپ کو نیند نہ آئے : دور سوئے سے جگا کر پڑے گا اور ناں۔
 اب اپنی بیگم کو بھیج دیں۔“
 ”بہت اچھا۔“

ابھی دھان سنبھلی کمرے سے نکلا نہیں تھا کہ ایک گونجیلی آواز
 نے انہیں چونکا دیا۔
 ”یہ کیا ہو رہا ہے ؟“



محمود، فاروق اور فرزانہ نے کریم بابا کے کوارٹر کے دروازے پر
 دستک دی۔ خود ہی اندر سے آواز آئی :
 ”کون ہے ؟ اندر آجائیں۔“

تینوں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا سفید
 ڈاڑھی والا ایک بوڑھا بستر پر بھافت اور بے لیٹا تھا۔ اس کا صرٹ منہ
 بھافت سے باہر تھا۔ کمرے میں ہر چیز بے ترتیبی کے عالم میں تھی۔
 چادر پانی کے علاوہ کمرے میں ایک سٹول اور ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی تھی۔
 محمود اور فاروق سٹول پر ٹپک گئے۔ فرزانہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بوڑھا انہیں
 حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ — آپ کون ہیں؟“

”پہلے تو یہ بتائیے، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بس جل رہا ہوں بخدا میں۔“

”خدا آپ کو جلد صحت عطا فرمائے۔“ محمود نے کہا اور پھر اپنا تعادل کرنے کے بعد اسے تفضیل سے بتا دیا کہ وہ اس کوٹھی میں کس غرض سے آئے ہیں۔

”تو آپ لوگ منظور ساجد کو بے گناہ خیال کرتے ہیں؟“

”لیکن اس جیسا شیطان شاید ہی کوئی سنے۔ اس نے تو اس شخص کو قتل کیا ہے، جس نے اُسے بچپن سے ماں کی طرح پالا۔ اس پر تو اس کے ہزاروں احسانات تھے، پھر بھی اس نے اتنا خوف ناک جرم کیا۔“

”لیکن ہمارا خیال ہے، وہ قاتل نہیں، اسی سلسلے میں ہم منگے ہو کر رہے ہیں۔ مع اسے پھانسی ہو جائے گی۔“

”یہ تو ہم سب کی خواہش ہے۔“ کریم بابا نے کہا۔

”ہم آپ کو ذرا پرلنے زمانے میں لے جانا چاہتے ہیں۔ جب احسان سائیش مرحوم کا بیٹا حادثے کا شکار ہو گیا تھا، جس کی کاد کے نیچے بچہ ہلاک ہوا۔ آپ نے اُسے دیکھا تو ہو گا۔“

”ہاں، وہ کئی روز تک آتا رہا تھا یہاں۔“ کریم بابا نے سردار

بھر کر کہا۔

”اس کا نام بتا بتا سکتے ہیں آپ۔ محمود نے پوچھا۔

”افسوس یہ ہمیں پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ میری یادداشت ایسی
کماں۔ رحمان صاحب کو شاید اس کا نام یاد رہ گیا ہو۔“

”خیر، کوئی بات نہیں۔ آنا بتادیں کہ احسان صاحب وہ لڑکا

کماں سے لائے تھے جو اس گھر میں مفسور ساجد کے تمام سے پلا۔
”یہ راز آج تک کوئی نہیں جان سکا۔ کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا
گیا تھا۔“

”آپ کے خیال میں مفسور ساجد کے علاوہ اور کون شخص احسان صاحب
کا قاتل ہو سکتا ہے۔“ خزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

”کوئی نہیں، یہ کام اس کے علاوہ کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ سب
لوگ احسان صاحب سے بے تحاشا پیادہ کرتے تھے۔ ان پر جان
چھڑکتے تھے، لیکن اس آستین کے ۔ ۔ ۔ ساپ نے انہیں ڈس لیا۔“

”لیکن جہاں تک مالی فائدے کا تعلق ہے۔ رحمان صاحب ان
کی بیوی اور بیٹے کو احسان صاحب کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ
پہنچا ہے۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے، لیکن رحمان صاحب کو دولت سے نہیں،
اپنے بھائی سے محبت تھی۔“

”جس رات انہیں قتل کیا گیا، آپ ان کے کمرے میں ان کی

زندگی میں گئے تھے؟“ محمود بولا۔

”ہاں گیا تھا۔ رات کا کھانا انہوں نے اپنے گھرے میں ہی کھایا

تھا۔ میں کھانا انہیں دینے گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اس وقت آپ نے ان کی کیا حالت دیکھی تھی۔ کیا وہ ہر روز

کی طرح نظر آتے تھے؟“

”نہیں، بجھے، بجھے سے تھے۔ بار بار سرد آہیں بھر رہے تھے۔

میں نے اس حد تک غمگین ہونے کی وجہ بھی پوچھی تھی۔ کہنے لگے، یہ

دنیا عجیب جگہ ہے، اس دنیا کے لوگ بھی عجیب ہیں۔ دوسروں کو دکھ

دینے کے عجیب و غریب طریقے سوچتے ہیں۔ کسی سے انتقام لینے پر اتر

آئیں تو انتقام لیے بغیر نہیں رہتے۔ لوگ یہاں دوسروں کے مرنے کا انتظار

کرتے رہتے ہیں کہ کب یہ مرے، اس کی دولت نہیں ہے۔ اس گھر

کے لوگ مجھے کس قدر چاہتے ہیں کریم۔ لیکن میں جانتا ہوں، ان

کی یہ چاہت میری دولت کی وجہ سے ہے۔ اگر میرے پاس اتنی

دولت نہ ہو تو یہ کبھی مجھ سے اتنی محبت نہ کریں۔ ان کے یہ الفاظ

مُن کر بچھے دھکا سا لگا تھا اور میں نے ان سے کہا تھا کہ نہیں

دیکھا اس گھر کے سبھی لوگ آپ سے پُر خلوص محبت کرتے ہیں۔ میری

بات سُن کر انہوں نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اور پھر کہنے لگے،

جہاں کریم اب تم جاؤ۔ تم اس دنیا کو نہیں جانتے۔ اس دنیا کے لوگوں

کو نہیں جانتے۔ میں نے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور

میں باہر نکل آیا۔ بس یہ کیفیت حقّی ان کی۔ دوسرے دن جب وہ اپنے کمرے میں مردہ ملے تو ان کے الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ یہاں تک کہ کہ کریم بابا خاموش ہو گیا۔

”کیا آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ خاص طور پر ان کا اشارہ کس کی طرف تھا؟“ فاروق نے سوال کیا۔

”نہیں، میرا خیال ہے، وہ گھر کے سب لوگوں کو ہی کہہ رہے تھے۔“ منصور ساجد سے ان کی محبت کا کیا حال تھا؟ محمود نے پوچھا۔

”وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتے تھے۔ اتنی کہ کیا کوئی اپنی مگی اولاد سے بھی کرے گا۔“

”اور خود منصور ساجد کا کیا حال تھا؟“

”ان آنکھوں نے تو یہی دیکھا کہ وہ ان پر ہر طرح جال بچھاؤ کیا کرتا تھا۔ لیکن ان کے قتل کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سب ظاہر میں کیا کرتا تھا، بونہی احسان تاجش صاحب نے اپنی دھیت لکھوائی، اس نے اپنا حصہ جلد از جلد وصول کرنے کے لیے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”کیا یہ کام گھر میں کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں۔“ کریم بابا کے بچے میں سختی آگئی۔

”بس جیسے ہی کچھ معلوم کرنا تھا۔ ضرورت پڑی تو آپ کو پھر

”تکلیف دیں گے۔“ محمود نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ بلا وجہ کوشش کر رہے ہیں۔ حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ صبح
ہر حال میں منصور شیطان کو پھانسی دے دی جائے گی“

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تینوں باہر نکل آئے۔

”یہ تو سچ سچ منصور قاتل نظر آتا ہے۔“ فرزانہ بڑبڑاتی۔

”اگر جھوٹ موٹ نظر آتا تو عدالت اسے سزا کیوں سناتی؟“

محمود نے کہا۔

”تم سچ سچ اور جھوٹ موٹ کے درمیان رہ کر کوئی بات
نہیں کر سکتے۔“ فاروق نے سنہ بنایا۔

”کیا وقت ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے، ہمارے پاس کتنا وقت

رہ گیا ہے؟“ محمود نے سوچ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

”گھڑی تو تمہارے ہاتھ پر بھی ہے اور وہ چل بھی رہی ہے۔“

فاروق بولا۔

محمود نے بے خیالی میں گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”تو بج رہے تھے۔

منصور ساجد کے پھانسی پانے میں سات گھنٹے باقی تھے۔“

”میرا خیال ہے، یہ ہمارا ناکام کیس ثابت ہوگا۔ ہم اسے

نہیں بچا سکیں گے۔“ فرزانہ کے بچے میں مایوسی کی جھلک تھی۔

”کیا یہ اندازہ تم نے کریم بابا کی ماتوں سے لگایا ہے؟“

”ہاں، احسان تابش سبھی گھر والوں کو خود غرض خیال کرتے تھے۔

انہیں کسی سے بھی کوئی امید نہیں تھی۔ ان حالات میں سب سے زیادہ

شک اس پر کیا جائے گا جو ان کا خون کا رشتہ دار بھی نہیں تھا۔
جیسے انہوں نے بے کر پالا تھا۔ جس کے بارے میں کسی کو بھی کچھ معلوم
نہیں کہ وہ کہاں سے آیا تھا۔ وہ کون تھا؟

” لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ گھر کا کوئی فرد قاتل
ہو ہی نہیں سکتا۔ بہت نزدیکی رشتے دار بھی بعض اوقات ایسا
بھیاں بک جرم کر بیٹھتے ہیں۔“ فاروق بولا۔

”خیر دیکھتے ہیں، کیا کچھ ہو سکتا ہے اور کیا نہیں۔“ آو آبا جان
کے پاس چلتے ہیں۔“ محمود نے تنگ آ کر کہا۔

اور وہ ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے۔ عجیب حالات تھے۔ کوئی
قابل ذکر بات سامنے نہیں آ رہی تھی۔ اچانک فرزانہ چلتے چلتے رُک
گئی۔ محمود اور فاروق اس سے آگے نکل گئے۔ پھر اسے ساتھ نہ
پاکر مڑے۔ انہوں نے دیکھا۔ فرزانہ ایک کمرے کے دروازے سے
کان لگائے کھڑی تھی۔ دونوں حیرت زدہ سے پہلے۔ فرزانہ کے
قریب پہنچ کر محمود نے دبی آواز میں کہا :

” کیا بات ہے؟“

” میں نے اس کمرے میں کسی کو سرگوشی میں باتیں کرتے سنا تھا،
پچھلے رات پر۔“

” تمہارے کان بچے جوں گے۔“ فاروق نے منہ ہنایا۔

” تم جانتے ہو میرے کان کبھی نہیں نیبھتے۔“ فرزانہ بولی۔

”ہاں، اس لیے کہ انہیں بجنا آتا ہی نہیں۔“ محمود مسکرایا۔

”شش، مجھے اندر ہونے والی گفتگو سن لینے دو۔“

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر کان

دروازے سے لگا دیے۔ محمود اور فاروق کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

اسی وقت ایک سرد آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟“

وہ بوکھلا کر مڑے۔

پہلے جاؤ

انہوں نے دیکھا — کمرے میں ایک لمبے قد کا آدمی اندر داخل ہو رہا تھا — اس نے کوٹ پہن رکھا تھا اور اس پر ٹائی بھی لگی ہوئی تھی — وہ سمجھ گئے کہ یہ ضرور وکیل رانا امانت علی ہیں —
 ”آئیے وکیل صاحب — رحمان تابش نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا —

”کیا چکر ہے، یہ کون صاحب ہیں، مجھے اس وقت کیوں بلایا گیا ہے، آپ کو معلوم ہے، یہ میرا دفتر کا وقت ہے —“ اُس کا لہجہ ناگوارانہ تھا —

”جی ہاں، معلوم ہے، یہ انیسٹر جیشید ہیں — انہی کی خواہش پر آپ کو یہاں بلایا گیا ہے —“

”انیسٹر جیشید؟ ادھر، اچھا — السلام علیکم —“ اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا، پھر ان سے مصافحہ کیا اور ان کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا :

”فرمائیے، کیا معاملہ ہے۔ میوہی کیا ضرورت پڑ گئی۔“

انسپکٹر جمشید نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ کیا معاملہ ہے۔ ساری

بات سن کر رانا امانت علی کا منہ بن گیا۔ اس نے کہا،

”میرا خیال ہے، اس جھنجٹ میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

پولیس، وکیل اور عدالیتیں کوئی کم عقل نہیں ہوتیں کہ کسی بے گناہ کو

پھانسی کی سزا دے دیں۔“

”لیکن کبھی کبھار ایسا ہونا ناممکن نہیں۔“ انسپکٹر جمشید بوسے۔

”میں سمجھتا ہوں، کم از کم اس معاملے میں ایسا نہیں ہوا اور بالکل

درست آدمی کو سزا دی گئی ہے۔“

”میں آپ سے صرف وصیت کے الفاظ سننے کا خواہش مند ہوں۔“

اور یہ بھی کہ احسان تابش نے کوئی اور خفیہ وصیت تو نہیں لکھوا رکھی؟“

”جی نہیں، ان کی وصیت سب کے سامنے لکھی گئی تھی۔ انہوں

نے اپنی ہر چیز کا سب کو برابر کا حصہ دار ٹھہرایا تھا۔ اسی پر عمل کیا گیا،

البتہ منصور ساجد کو اس کا حصہ نہ مل سکا، کیونکہ اسے کی موت

کے فوراً بعد جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ اب اس کے پھانسی پلنے کے

بعد اس کا حصہ بھی باقی رشتے داروں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، اس کے باوجود میں ان کی وصیت کے الفاظ تحریر کے

عین مطابق اپنے کانوں سے سنتا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہوتا چاہیے

کہ ان سب لوگوں کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ اگر منصور ساجد قاتل نہ

ہوا تو پھر ان میں سے کوئی ایک قاتل ہو گا اور اس صورت میں باقی لوگ بھی خطرے میں ہیں، کیونکہ وہ پولی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے انہیں بھی موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں چوکنے لگے۔

”یہ — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں لوگوں کے سچ اور جھوٹ کا ان کی آنکھوں میں دیکھ کر پتا لگانے کا ماہر ہوں۔ میں نے منصور ساجد کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور وہ مجھے بے گناہ نظر آیا ہے۔“

”لیکن یہ ضروری نہیں کہ آپ کا اندازہ درست ہی ہو۔“

”ہاں، یہ ضروری نہیں۔ لیکن آپ کے نزدیک، میرے نزدیک یہ اندازہ بالکل درست ہے اور میں چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کو ثابت کر دوں گا، اگر نہ کر سکا تو اس پیشے سے ریٹائر ہو جاؤں گا۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں بھی یہیں موجود رہوں گا اور دیکھوں گا کہ آپ کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں۔ میں ابھی اپنے اسسٹنٹ کو فون کرتا ہوں، وہ وصیت نامہ لے آئے گا۔“ امانت علی نے کہا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ انہوں نے کہا اور وکیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”انسپکٹر بشید رحمان تالیش کی طرف مڑے۔“

”آپ اپنی جگہ کو بھیج دیں۔“

”جی اچھا۔“ اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

”امانت علی جلد ہی اپنے اسسٹنٹ کو فون کرنے میں کامیاب

ہوگی۔ اس نے اُسے احسان تابش کا وصیت نامہ لے کر پہنچنے کی ہدایت کی اور وسیور دکھ دیا۔

آپ یہاں احسان صاحب کی زندگی میں آتے جاتے تو رہتے ہوں گے۔

”جی ہاں“ میں اُن کا وکیل ہی نہیں دوست بھی تھا۔ رانا امانت علی نے بتایا۔

”احسان صاحب کا سلوک منصو و ساجد سے کیسا تھا؟“
 ”بالکل ایک باپ کا اور وہ بھی ان کا سگا بیٹا ہی بن کر دکھاتا تھا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اُس کے دل میں کھوٹ ہے۔“
 ”کبھی احسان صاحب نے آپ کو بھی نہیں بتایا کہ انہوں نے منصو و ساجد کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟“

”جی نہیں، یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ ظاہر ہے وہ اسے یتیم خانے سے ہی لے کر آئے ہوں گے۔“ وکیل نے کہا۔
 ”ہوں، اگر یہ بات سچی تو احسان تابش صاحب کو سب لوگوں سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو بھی انہوں نے نہیں بتایا، آخر کیوں، اس میں کیا حرج تھا۔ وہ سب کو بتا دیتے کہ وہ اُسے یتیم خانے سے لے کر آئے ہیں۔“

”شاید یہ بات انہوں نے اس لیے نہیں بتائی تھی کہ جب منصو و بڑا ہو گا تو گھر کے لوگ اسے طعنے دیں گے کہ اسے یتیم خانے سے

نیا گی تھا۔

”لیکن کچھ نہ بتانے کی صورت میں تو اور بھی زیادہ باتیں منسوخ ساجد

کو سنائی گئی ہوں گی۔“

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”آپ نے اس مسئلے پر اپنے دوست کو کریدا تو ہو گا۔“

”جی نہیں، میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔“

”احسان تابش صاحب نے معاوضے کی صورت میں آپ کو اپنی

دولت میں سے کتنا دیا؟“

”وصیت نامہ آ رہا ہے، ابھی سن لیجیے گا۔“

”ہوں، ٹھیک ہے۔“

اسی وقت انہوں نے تیز تیز قدموں کی آواز سنی۔ اور پھر رحمان

تابش کی تھکائی ہوئی آواز ان کے کانوں سے ٹکراتی۔

”انسپکٹر صاحب، میں یہ باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔“

انہوں نے چونک کر سر اُپر اٹھایا۔ رحمان تابش، محمود، فاروق

اور فرزانہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے

کے آثار تھے، جبکہ وہ تینوں پُر سکون نظر آ رہے تھے۔

”کیا ہوا، خیر تو ہے۔“

”یہ تینوں میری بیگم اور بیٹی کی باتیں چُپ کر سُن رہے تھے۔“

کمرے کے دروازے سے کان لگاتے کھڑے تھے۔“

”کیوں بھتی، یہ کیا حرکت تھی؟“

”ہم کریم بابا کے کمرے سے نکل کر آپ کی طرف آ رہے تھے کہ اس کمرے سے کسی کے سرگوشی میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے حیران ہو کر کان دروازے سے لگا دیے، یہ سوچ کر کہ ضرور کوئی احسان تابش مرحوم کے قتل کے سلسلے میں بات کر رہا ہے۔ عین اسی وقت رحمان صاحب و ماں پہنچ گئے۔ پس اتنی سی بات تھی۔“

”بات دراصل یہ ہے جناب کہ ہم بیاں ایک قتل کے کیس کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔ ایسے میں اگر ہمیں کوئی سرگوشی سنائی دے گی تو ظاہر ہے، ہمارے کان کھڑے ہوں گے۔“ نظر آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟

”میں سمجھا ہوں، یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔“

”ہم سراغ خاتون کی زندگی کا دن رات کا معمول اسی قسم کی باتیں ہیں۔ کیا کیا جائے؟“

”اچھا خیر، میں اپنی بیگم کو بھیجتا ہوں۔“ وکیل صاحب یہیں ٹھہریں گے یا انہیں میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

”ان کے اسسٹنٹ آنے والے ہیں، فی الحال آپ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ اسسٹنٹ آجائیں تو انہیں یہاں لے آئیے گا۔“

”پہلیے رانا صاحب۔“

ان کے جانے کے بعد انسپکٹر جمشید نے تینوں کو گھورا۔ پھر بولے :

”تمہیں محتاط رہ کر سرگوشیاں سننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔
تینوں کو ایک ساتھ دروازے سے کان لگانے کی یہ ضرورت تھی۔
”جی نہیں شعلی ہو گئی۔“ فرزانہ نے دلی آواز میں کہا۔

”یہ بتاؤ، کوئی کام کی بات بھی سن پائی ہو یا نہیں؟“
”میں نے داخل اشرف کی سرگوشی سنی تھی، لیکن تمام الفاظ
صاف سنائی نہیں دیے۔ بہر حال وہ کسی خط کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک
ایسا خط جو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا، شاید اس نے یہ الفاظ کہے تھے،
کاش ہم نے اس خط کو پڑھ کر دیکھ لیا ہوتا۔“

”عمود، فاروق، کیا تم بھی کچھ سن سکے ہو؟“

”جی نہیں، ہمارے کان فرزانہ جتنے لمبے کہاں؟“ فاروق نے
الیوسانہ لہجے میں کہا۔

”تو کھینچ کر لمبے کر لو نا۔“ فرزانہ نے مشورہ دیا۔

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا روبینہ تالیش
چلی آ رہی ہے۔

”آئیے بیگم صاحبہ، ابھی ابھی آپ اپنے کمرے میں اپنے بیٹے
سے ایک خط کا ذکر کر رہی تھیں، اس خط کو ابھی تک آپ پڑھ بھی
نہیں سکیں، وہ خط کس نے لکھا ہے اور آپ نے ابھی تک کیوں نہیں
پڑھا؟“ انسپکٹر جشید نے مہلت دیے بغیر کہا۔

”جی خط، کیسا خط؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ روبینہ تالیش

بوکھلا اٹھی۔

”آپ میرے الفاظ سن چکی ہیں، ان کا مطلب بھی سمجھ چکی ہیں۔ کیا آپ اس خط کے بارے میں کچھ بتانا پسند نہیں کرتیں؟“ اسپرٹ جیشید اسے بے غور دیکھتے ہوئے بولے۔

”آپ کے بچوں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ انہوں نے غلط سنا ہے۔ میں اپنے بیٹے سے کسی خط کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔“

”آپ کچھ چھپا رہی ہیں، لیکن یہ بات کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اگر آپ اس خط کے بارے میں صاف صاف بتا دیں تو شاید ہم سب مل کر ایک بے گناہ کی زندگی بچا لیں۔ اس کا فائدہ آپ کو بھی پہنچے گا۔ اصل قاتل پکڑا جائے گا۔ اور آپ لوگ اس سے محفوظ ہو جائیں گے۔“

”ہیں کہہ چکی ہوں کہ ہم کسی خط کے بارے میں بات نہیں کر رہے تھے۔“

”خیر چھوڑیے۔ میں بہت جلد یہ بات معلوم کر لوں گا کہ اس خط کی حقیقت کیا ہے۔ آپ کے خیال میں احسان تابش کو منصور ساہو کے علاوہ اور کون قتل کر سکتا تھا۔“

”کوئی بھی نہیں۔ سب کو ان سے پہلے پناہ محبت تھی۔ درمیان تابش نے کہا۔“

”لیکن احسان صاحب کا خیال تو یہ تھا کہ سب گھر والوں کو بچ سے نہیں، میری دولت سے محبت ہے۔“

”کی مطلب بیٹا آپ کیسے کر سکتے ہیں؟“

”یہ بات کریم بابا نے بتائی ہے۔“

”لیکن ہم نے ان کے منہ سے کوئی بات نہیں سنی۔“

”جس رات انہیں نیند والی گولیاں دی گئیں، اس روز وہ

بہت پریشان تھے۔ کیا آپ نے بھی انہیں پریشان محسوس کیا تھا؟“

”جی نہیں سمجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ یوں بھی اب

اس واقعے کو دو سال ہو چکے ہیں۔“

”ہوں۔ خیر، آپ جاسکتی ہیں۔ مہربانی فرما کر اپنے بیٹے

راہیل اشرف کو بھیج دیں۔“

”اچھا! اس نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد راہیل اشرف

اندرو داخل ہوا۔“

اس کے چہرے پر فکر کے بادل تیر رہے تھے۔ آنکھوں میں لہری

سوچ تھی :

”میرے آپ اپنے ہم کے ساتھ اشرف کیوں لگائے ہوئے ہیں؟“

”اس لیے کہ میرے ہم باپ کا نام اشرف تھا۔“

”کیا مطلب؟“ اس کے ہمیشہ چونک کر بولے۔ محمود فاروق اور فرزانہ

بھی حیران ہو کر اسے دیکھنے لگے۔“

”جی ہاں! یہ میری والدہ کی دوسری شادی ہے۔ رحمان تاج شہرے

سوئیے باپ ہیں۔ میں ابھی ایک سال کا تھا کہ میرا باپ مر گیا۔ اس

کے ایک سال بعد میری ماں نے دوسری شادی کر لی۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔ اچھا، وہ خطا کیا معاملہ ہے۔ شاید

آپ کو والدہ نے منع تو کر دیا ہوگا کہ خطا کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔

”جی نہیں، ہم کسی خطا کے بارے میں بات کر ہی نہیں رہے

تھے، بتائیں کیا۔“

”سوئیے بتایا کہ دولت حاصل کرنے کے لیے ہلاک کرنے کا منصوبہ

آپ نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ راجیل اشرف نے بوکھلا کر

کہا۔

”کیوں، کیا یہ سچ نہیں؟“

”اتنے مہربان اور ہمدرد تیار کیا کو بھی بھلا کوئی ہلاک کرنے کے

بارے میں سوچ سکتا ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”ہوں، خیر آپ جاسیے اور یاسمین تارا کو بھیج دیجیے، لیکن دو

منٹ بعد۔“

”آپ یقین کریں، میں نے اور میری ماں نے ایسا کوئی کام نہیں

کیا۔“

”آپ بھی بے فکر رہیں۔ جب تک آپ کے غلات کوئی ثبوت

نہیں مل جاتا، آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

راجیل اشرف فکر مندانہ انداز میں کمرے سے نکل گیا۔ انہوں نے

ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

پورے کیس میں یہ دو باتیں کام کی معلوم ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرنے سے پہلے احسان تابش بہت پریشان تھے اور انہوں نے گھر کے افراد کے لیے خود غرض کا نقطہ استعمال کیا۔ دوسرے یہ کہ راجیل اشرف رحمان تابش کا سگا بیٹا نہیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ اسے اپنے سوتیلے باپ یا سوتیلے تایا سے بس یونسی سی محبت ہوگی اور میرے خیال میں دولت حاصل کرنے کے لیے وہ یہ کام کر سکتا تھا۔

”بلکہ ان حالات میں تو رحمان تابش کی زندگی بھی خطرے میں ہے اور یاسمین تمہارا کی۔۔۔۔۔“

محمود کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ یاسمین تار ڈرائنگ روم میں داخل ہو چکی تھی، لیکن انہوں نے اس کے قدموں کی آواز نہیں سنی تھی۔ شاید وہ دبے پاؤں جان بوجھ کر داخل ہوئی تھی۔ یا پھر باتوں کی وجہ سے وہ چاپ نہیں سن سکے تھے۔ انہوں نے دیکھا، یاسمین تار ڈرائنگ روم کی آٹھیں صبر سے پھیل گئی تھیں، شاید اس نے محمود کے الفاظ صحت سن لیے تھے۔

”اگر آپ لوگوں کا خیال درست ہے تو پھر میری زندگی بھی خطرے میں ہے اور اب میں یہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہروں گی۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”لیکن آج رات ہم یہاں موجود ہیں۔ آپ کو ٹھکانہ ہونے کی ضرورت

”نہیں۔ ہماری موجودگی میں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“

”ہوں، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”کیا آپ کے خیال میں منصور ساہد قاتل ہے؟“

”جی نہیں، پہلے روز سے میں اس خیال پر ڈٹی ہوئی ہوں کہ وہ

قاتل نہیں ہے، اُسے زبردستی قاتل بنایا گیا ہے۔ اس کے خلاف سازش

کی گئی ہے، کیونکہ اس گھر میں جتنی محبت وہ ماموں جان سے کرتا تھا میں

نے کسی کو کرتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ شاید مجھے بھی اپنے ماموں سے

اس درجے محبت نہیں تھی جتنی منصور کو۔ وہ دن رات ان کی خدمت میں

لگا رہتا تھا۔“

”کیا خبر، وہ دولت میں سے حصہ لینے کے خیال سے اتنی محبت

جتا رہا ہو؟“ محمود بول پڑا۔

”نہیں، موت سے ایک سال پہلے ماموں جان اپنی وصیت لکھوا چکے

تھے۔ وصیت سب کی موجودگی میں لکھوائی گئی تھی، منصور کو یہ معلوم ہو چکا

تھا کہ اس کے محسن کی وفات کے بعد اُسے کیا ملے گا۔ اس کے بعد

بھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اسی طرح خدمت کرتا

رہا تھا جبکہ دوسرے کچھ بدل سے گئے تھے۔“ یاسمین ”تارا بھگے بیٹر کہ گئی۔“

”بدل سے گئے تھے۔ کیا مطلب؟“

”وصیت کے بعد ان کی نظریں ماموں جان سے بدل گئی تھیں،

جیسے انہیں اب ان سے کوئی محبت نہ رہ گئی ہو! گویا وصیت سے پہلے

وہ اس لیے زیادہ سے زیادہ محبت جتاتے رہے تھے کہ دولت میں زیادہ حصہ وصول کر سکیں۔

”اوہ“ ان کے منہ سے نکلا۔ فرزانہ نے فوراً ہی سوال کیا :

”خود آپ کا کیا حال تھا۔ کیا آپ بھی بدل گئی تھیں؟“

”نہیں۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: ”مجھے اپنے اموں سے

دولت کے لیے محبت نہیں تھی۔“

”آپ کے ماں باپ وفات پا چکے ہیں؟“

”جی ہاں، ان کی وفات کے بعد ہی ماموں جان مجھے یہاں

لے آئے تھے۔“ اُس نے کہا۔

”اس وقت منصور ساجد بھی اس گھر میں آچکا تھا؟“

”جی ہاں، اگر میں اس گھر میں پہلے آجاتی تو شاید ماموں جان

کسی اور کو لےنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے۔“ یہ کہتے وقت اس کی

آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں افسوس ہے، ہم نے آپ کو پُران باتیں یاد کرانے کی

کوشش کر دیا۔“ فرزانہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں، آپ تو اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔“

”آپ کے ماموں جان نے کبھی آپ کو بھی سنیں بتایا کہ وہ

منصور کو کہاں سے لائے تھے؟“ فاروق نے پوچھا۔

”جی نہیں، یہ بات وہ اس لیے نہیں بتاتے ہوں گے کہ بعد میں

لوگ منصور ساجد کو طعنے نہ دیں۔ اس نے خیال ہی ہر کیا۔
 ”ہوں خیر، آپ جاسکتی ہیں۔ مہربانی فرما کر ذرا رکٹ کو بھیج دیں۔“

”جی اچھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔“

تھوڑی دیر بعد راکٹ اُن کے سامنے بیٹھا تھا۔
 ”مسٹر راکٹ، آپ کو یہاں ملازمت کرتے کتنا عرصہ گزرا؟“ انسپکٹر جمشید نے اس سے پہلا سوال کیا۔

”تقریباً پندرہ سال تو ہو ہی گئے۔“

”اس کا مطلب ہے جس زمانے میں احسان متايش مرحوم کا بیٹا حادثے کا شکار ہوا، آپ اس گھر میں نہیں تھے۔“
 ”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ نے اس گھر میں رہتے ہوئے کیا محسوس کیا۔ احسان صاحب کس سے زیادہ محبت کرتے تھے؟“

”میرے خیال میں وہ سب سے زیادہ منصور ساجد صاحب سے ہی محبت کرتے تھے اور پھر اپنی بیجانہ یا سمین، اما سے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں باقیوں سے کوئی محبت نہیں تھی۔ محبت تو وہ مجھ سے اور کریم بابا سے بھی کرتے تھے۔“

”ہوں، اور دوسروں کی محبت کس درجے کی تھی؟“

”منصور ساجد ان سے دایمانہ محبت کرتا تھا، ان پر جان چھڑکتا تھا۔“

یہ سن سنا بھی اموں کی دیوانی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے، راحیل اشرف، اس کے والد اور والدہ احسان

تاہش مرحوم سے محبت نہیں رکھتے تھے۔“

— ”بظاہر تو انہیں بھی ان سے محبت تھی، لیکن میرا خیال ہے، حقیقت میں

ایسا نہیں تھا۔“

”ہوں، محمود، فاروق اور فرزانہ، تمہارا اس گھر میں رہنا نقصان دہ

ہے۔“ ”خود“ گھر سے چلے جاؤ۔“ اچانک انسپکٹر ہنسنے لگا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور

پھر کوئی سوال کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”دوسرے ہی لمحے وہ گھر سے

باہر جا رہے تھے۔“

رحیم گوگرد

”یار! یہ کیا بات ہوئی۔ ہمارا کمرے میں رہنا بھلا نقصان وہ کس طرح ہے؟“ غابوق نے حیرت زدہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ برآمدے میں آکر دُک گئے تھے۔

”انہوں نے یہ بات ضرور کسی مقصد کے تحت کہی ہے۔ میرا خیال ہے انہیں راحیل اشرف اور اس کی ماں پر شک ہو گیا ہے۔ وہ کسی خط کا بھی ذکر کر رہے تھے، شاید آبا جان کو یہ خطہ محسوس ہوا ہو کہ کہیں وہ اس خط کو جملانے کی کوشش نہ کریں۔“ محمود نے خیال ظاہر کیا۔

”اوہ ماں! بالکل یہی بات ہے۔ محمود! تمہاری عقل کا بھی جواب نہیں۔ آبا جان نے ہمیں اسی لیے باہر بھیج دیا ہے کہ ہم ان دونوں کی نگرانی کریں۔ چلو ان کے کمرے کے پاس چلیں۔“ غمزدان نے پُرچوش سمجھ میں کہا۔

تینوں اس کمرے کے قریب پہلے آئے۔ جس کے دروازے سے

کان لگا کر انہوں نے سرگوشیاں سننے کی کوشش کی تھی۔ دروازے کے عین اوپر انہیں ایک روشن دان نظر آیا۔ دروازے میں کوئی جھری نہیں تھی۔ تالا بھی دروازے میں نہیں تھا کہ اس کے سوراخ سے اندر جھانکا جا سکتا؛ لہذا ان کی نظریں روشن دان پر جم گئیں۔

”میرا خیال ہے،“ یہ روشن دان ہی ٹھیک رہے گا۔“ فرزانہ دبی آواز میں بڑبڑائی۔

”تو ہم کب کہتے ہیں کہ یہ روشن دان غلط رہے گا؟“ یہ کہتے ہوئے فاروق زینے کی طرف چل پڑا۔ محمود اور فرزانہ نے اس کا ساتھ دیا۔ چھت پر آکر فاروق منڈیر پر اونڈھا لیٹ گیا اور آگے کی طرف دھنکنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا سر نیچے جھکنے لگا۔ محمود اور فرزانہ نے اس کی ایک ایک ٹانگ پکڑ لی۔ یہاں تک کہ فاروق کا آدھا دھڑکیٹنے لگا۔ اب اس کا سر عین روشندان کے سامنے تھا اور وہ روشندان میں سے اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے دیکھا، راحیل اشرف اپنی ماں کے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ انہوں نے ایک الماری کھول رکھی تھی اور اس کی تمام چیزیں جلدی جلدی اس میں سے نکال رہے تھے۔ اسی وقت روبینہ تالمیش کی دبی دبی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”لاش تم نے اس خط کو اسی وقت جلا دیا ہوتا۔ اب فلا جانے تم کہاں رکھ بیٹھے ہو، اگر یہ جاسوس کہیں کے وہ خط تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کیا ہو گا۔“

”مئی، آپ تو یونہی گھرا رہی ہیں۔ ان سے پہنچے ہم اس خط کو تلاش کر لیں گے اور جلا دیں گے۔“
 ”کاشش ایسا ہو جائے۔“

وہ المادی کی چیزیں نکال نکال کر دیکھتے رہے۔ المادی میں بہت سی کتابیں بھی تھیں۔ ان کتابوں کو بھی کھول کھول کر وہ خط کو تلاش کر رہے تھے۔ یہ کام جلد ختم ہونے والا نہیں تھا اور فاروق اتنی دیر تک اٹل ٹکا نہیں رہ سکتا تھا۔ محمود اور فرزانہ اتنی دیر تک اسے دکھاتے رہ سکتے تھے؛ لہذا فاروق نے اپنی غائبی کو ہلکا سا ٹھکا دیا۔ محمود اور فرزانہ نے اسے اوپر کھینچ لیا۔
 ”کیوں کیا رہا؟“

”وہ اس خط کو کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ ظاہر ہے، دو سال پہلے کی بات ہے۔ اب وہ اسے تلاش کر کھجلا دینا چاہتے ہیں۔“ فاروق نے دھیمی آواز میں کہا۔

”لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اباجان کو چل کر بتانا چاہیے، تاکہ وہ آکر اس کمرے سے خط برآمد کر لیں۔“ محمود بولا۔
 ”ہاں، ٹھیک ہے۔“ دونوں ایک ساتھ بولے۔

تینوں تیز تیز چلتے ڈرائنگ روم کی طرف آئے۔ جوشی دروازے پر پہنچے، ان کے آٹھنے قدم رک گئے۔ انہوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اسی وقت انہوں نے قدموں کی آواز سنی۔



اُن تینوں کے جانے کے بعد انپکٹر جمشید راکٹ سے بولے :
 ”مسٹر راکٹ، آپ سے پہلے بھی تو یہاں کوئی ڈرائیور کام کرتا
 رہا ہوگا۔“

”جی ہاں، ان کی نظر کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے ملازمت
 چھوڑ دی تھی۔“ راکٹ بولا۔

”آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”احسان صاحب نے بتائی تھی۔ میں جب انہیں کار میں کہیں
 لے کر جاتا تو وہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔“ اس نے سمجھ بھلا کر

”کی آپ کو اس کا نام پتا معلوم ہے؟“
 ”نام ضرور معلوم ہے، پتا نہیں۔ ویسے اگر آپ ان کا پتا معلوم
 کرنا چاہتے ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ انپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔
 ”احسان صاحب ملازمین کی فائل کھولنے کے عادی تھے۔“

”اس میں اس کے متعلق تمام باتیں لکھتے تھے؛ لہذا اس فائل میں ان کا
 نام پتا موجود ہوگا۔ ان کا نام رحیم گوگرٹا تھا۔“

”رحیم گوگرٹا، یہ کیسا نام ہوا؟“ انپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

”گوگر شاید ذات ہے۔“

”ہوئی، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مجھے احسان تابش صاحب کا

ریکارڈ تلاش کرنا ہوگا۔“

”جی ہاں، آئیے میرے ساتھ، میں آپ کو اس الامری تک لے

چلتا ہوں، جس میں وہ اس قسم کی چیزیں رکھا کرتے تھے۔“

”بہت بہت شکریہ“ انہوں نے اُسٹھے ہوئے کہا۔

راکٹ انہیں لے کر احسان تابش کے کمرے میں آیا۔ یہ کمرہ

اب ویران پڑا تھا۔ ان کی موت کے بعد اسے کس نے، سچائی نہیں

کیا تھا۔ یوں بھی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ کوشی میں

پہلے ہی کئی کمرے خالی پڑے تھے۔ کمرے کے دروازے پر تالا بھی

نہیں لگا ہوا تھا۔ چٹخنی گرا کر راکٹ اندر داخل ہوا۔ انیسٹم جیشید نے

اس کا ساتھ دیا۔ کمرے کے فرش پر گرو کی گہری تہ جی ہوئی تھی۔

”گویا اب اس کمرے کی صفائی بھی نہیں کی جاتی۔“ انیسٹم جیشید

بڑبڑلائے۔

”جی نہیں، یاسین تارا صاحبہ نے دو چار مرتبہ صفائی کرنے والی

سے کہہ کر اس کمرے کی صفائی کرائی ہے۔ کسی اور نے تو پوچھا بھی

نہیں۔“

”انسان کے مرنے کے بعد لوگ کس قدر جلد سے بھلا دیتے ہیں۔“

انیسٹم جیشید نے سر د آہ بھری۔

”ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“

”احسان مہاش کی موت کے بعد آپ کو اس گھرنے نے بدستور

ڈمایور رکھا۔“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

”جی ہاں، ان کی موت کے تین دن بعد میں نے جانے کی اجازت

انگی تھی، لیکن رحمان صاحب نے اپنی ملازمت بدستور جاری رکھنے کے

سے کہا اور میں نے منظور کر لیا۔“

یہ کہتے ہوئے راکٹ نے ایک اٹماوی کے پٹ کھول دیے۔

اور پھر اس میں سے ایک فائل نکال کر اس کی گرد بھاڑنے لگا۔ گرد

بھاڑنے کے بعد اس نے فائل دائیں کی طرف بڑھا دی۔

چند منٹ کی ورق گردانی کے بعد انہیں رحیم گوگرٹ کا نام اور

پتا نظر آ گیا۔ اس میں اس کی زندگی کے دوسرے حالات بھی درج تھے کہ

رحیم گوگرٹ نے کہاں کہاں ملازمت کی، لیکن انسپکٹر جمشید کو اس تفصیل کی

کوئی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی پتا نوٹ کیا اور راکٹ

سے بولے :

”میں ذرا رحیم گوگرٹ سے ملنے جا رہا ہوں۔ میرے بچوں کو بتا

دیجیے گا اور یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ ہوشیار رہیں۔“

”بہت بہتر۔“ اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید تیز تیز قدم اٹھاتے گھر سے باہر آئے اور جیب میں

بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ ٹھیک آٹھ منٹ بعد وہ جیب سے اتر کر ایک

گلی میں داخل ہوئے۔ اور منبر پڑھتے آگے بڑھنے لگے اور پھر دوسری طرف سے آنے والے ایک راہگیر کو روکتے ہوئے بولے :
 ”کیوں جناب! رحیم گوگڑا تیرا مکان کونسا ہے؟“
 ”گلی کے آخر میں سامنے والا مکان ہے بھائی“ اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

الپٹر جمشید اس مکان کے دروازے پر پہنچے۔ اب ان کا دل دھڑک رہا تھا، وہ یوں محسوس کر رہے تھے کہ جیسے بہت جلد انہیں کوئی خاص بات معلوم ہونے والی ہے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔
 ”کیا بات ہے؟“ اس کا منہ دھک بھرا تھا۔
 ”رحیم گوگڑا کا مکان یہی ہے؟“

”ہاں، یہی ہے۔ لیکن وہ بیمار ہے اور کسی کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ ہمیں تو دوا اور کھانے کے لالے پڑے ہیں۔“
 ”میں اُن سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ شاید میں ان کی دوا کا بھی انتظام کر سکوں۔“ الپٹر جمشید بولے۔
 ”خدا آپ کا بھلا کرے۔ اندر آجاسیے۔“

الپٹر جمشید اندر داخل ہوئے۔ اندر بے ترتیبی کا راج تھا۔ ہر چیز سے غربت ٹپک رہی تھی۔ بے سرو سامانی دکھائی دے رہی تھی۔

”آپ ہمارا حال دیکھ رہے ہیں۔ جب جوان اولاد ساتھ چھوڑ

جائے تو بوڑھے ماں باپ کا یہی حال ہوتا ہے۔“

”اوہ، تو آپ کی جوان اولاد نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔“

”ماں، ہمارا ایک ہی بیٹا تھا۔ ہم نے اسے پالا پوسا، جوان کیا

پھر اس کی شادی کی۔ رحیم نے اُسے ڈرائیوری سکھائی۔ جب وہ

کمانے کے قابل ہوا تو اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے چلا گیا۔ اب۔

میرے جانے اس کے ساتھ کہاں رہتا ہے؟“

”یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ رحیم بھائی کہاں ہیں؟“

”اندر دوسرے کمرے میں۔“

وہ اندر آئے۔ انہوں نے دیکھا، ایک بہت بوڑھا آدمی بستر

پر پڑا گواہ رہا تھا۔ اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔

”رحیم، دیکھو، کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔ اس کی بیوی نے

دوا بندہ آواز سے کہا۔ شاید وہ اُونچا بھی سننے لگا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے تک انپیکٹر جمشید کو

لمٹکی باندھے دیکھتا رہا، پھر بولا :

”آپ..... آپ کون ہیں؟ اس کی آواز میں ٹکڑا ہٹ تھی۔

”میں انپیکٹر جمشید ہوں۔ احسان آہش کے قتل کی تفتیش کرتے

سمے سے شروع کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے پاس آدابوں

”تو کیا منظور سا بعد قاتل ثابت نہیں ہوا؟“

”وہ جیل میں ہے۔ اسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی ہے۔ صبح اسے پھانسی ہونے والی ہے، لیکن میرا خیال ہے، وہ قاتل نہیں ہے۔“
 ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ وحیم گوگڑ بولا۔
 ”بہت غیب، آپ، کیا یہ خیال کیوں ہے۔“ انسپٹر جرشید خوش ہو کر بولے۔

”وہ میرے سامنے ہی اس گھر میں لایا گیا تھا۔ احسان صاحب نے اسے سگے باپ کا پیار دیا تھا۔ وہ بھی سگی اولاد کی طرح انہیں چاہتا تھا۔ ان حالات میں میں نہیں سمجھتا کہ وہ قاتل ہو سکتا ہے۔“
 ”تو اسے آپ کے سامنے لایا گیا تھا۔“
 ”ہاں۔“

”احسان تابش اسے کہاں سے لائے تھے؟“
 ”مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا۔“
 ”کیوں؟“ انسپٹر جرشید بے چین ہو کر بولے۔
 ”احسان تابش نے مجھ سے قسم لی تھی کہ میں یہ راز کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اُس نے کہا۔“

”لیکن ایک شخص کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ شاید آپ کے یہ بتانے کے بعد میں منصور ساجد کی زندگی بچا سکوں، ان حالات میں ہمارے مذہب نے قسم توڑنے کی اجازت دی ہے۔“
 ”کیا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں، قسم توڑنے کی ان حالات میں اجازت ہے ! البتہ کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ میں آپ کو کفارہ ادا کرنے کے لیے پیسے دوں گا۔ آپ ان پیسوں کو خیرات کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ خود آپ کو اس وقت شدید ضرورت ہے، اس لیے اپنی ذات پر بھی خرچ کر سکتے ہیں۔ تاہم میں اتنے پیسے دے دوں گا کہ آپ خرچ بھی کر سکیں اور خیرات بھی دے سکیں۔“ تو پھر میں ضرور بتاؤں گا۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، مطلب یہ تھا کہ وہ کمرے سے نکل جائے۔ بڑھیا اُسے گھورتی ہوئی چلی گئی اور دھیم گونگڑی آواز میں انہیں بتانے لگا۔

دروازہ ٹوٹ گیا

ڈرائنگ روم میں انہیں اپنے والد نظر نہیں آئے تھے۔ یہی دیکھ کر انہیں صبر نہ ہوئی تھی کہ وہ اچانک کہاں چلے گئے۔ تھوڑی دیر پہلے تو وہ ڈرائنگ روم میں چھوڑ گئے تھے۔ اور ان کا کہیں جانے کا پتہ وگراں نہیں تھا۔ قدموں کی آواز سن کر وہ مڑے تو انہوں نے راکٹ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ محمود نے فوراً پوچھا:

”مسٹر راکٹ، یہ ہمارے آبا جان کہاں گئے ہیں؟“

”وہ ایک کام سے گئے ہیں کوٹھی سے باہر۔ وہ بولا۔“

”لیکن کہاں؟ ان کا تو کہیں جانے کا پتہ وگراں نہیں تھا۔“

”احسان تاملش صاحب کے سابقہ ڈرائیور سے ملنے گئے ہیں۔“

اس نے بتایا۔

”اوہو، تو انہیں اس کا نام پتا معلوم ہو گیا؟“

”ہاں، اس سے میں نے ان کی مدد کی ہے۔“

”لیکن انہوں نے گھر سے باہر جا کر ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔“

فرزاد نے بے خیالی میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ راکٹ چونکا۔

”کچھ نہیں آج بھی چلیں۔ ہمیں اپنا کام جلدی رکھنا چاہیے۔ مسٹر راکٹ، آپ بھی جاسکتے ہیں، آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”بہت اچھا۔“ راکٹ نے کہا اور ان کے پاس سے چلا گیا۔

”اب ہم کیا کریں۔ اگر روبینہ تباہی اور راحیل اشرف نے وہ

خط تلاش کر کے جلا دیا تو شاید ہم کوئی بہت اہم راز جاننے سے

محروم رہ جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منصور ساجد کو بے گنہ گار ثابت

نہ کر سکیں۔“ محمود بولا۔

”تو پھر چلو۔ ان کے کمرے پر دھارا بول دو۔ ڈرکس بات

کا ہے۔ کم از کم وہ ہمارے سامنے تو خط جلاتیں گے سنیں؟“ فرزاد

نے دلیر ہو کر جواب دیا۔

”ہاں، اب یہی کرنا ہو گا۔“ فاروق بولا۔

تینوں ایک بار پھر روبینہ تباہی کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے دیے پاؤں آگے بڑھنا شروع کیا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ جلدی کرو۔ خطا کے لیے اس خط کو جلدی

ڈھونڈ نکالو۔“ اندر سے روبینہ کی آواز آئی اور انہوں نے اطمینان کا

سانس لیا کہ ابھی یہ لوگ خط تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے۔

محمود نے دروازے پر دستک دی تو اندر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

چند سیکنڈ بعد روہیتہ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔
 ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولیں، ہمیں ایک ضروری کام ہے آپ سے۔“
 ”افسوس اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا۔ میں اور میرا بیٹا اب آرام کرنے کے لیے لیٹ چکے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا مسٹر راحیل الگ کمرے میں نہیں سوتے؟“ محمود نے قدرے
 جھنجھلا کر کہا۔

”ہاں، لیکن آج رات میں خوف محسوس کر رہی ہوں۔ کیا خبر
 آپ لوگوں کا ہی خیال درست ہو۔ اور قاتل منصور ساجد کے علاوہ کوئی
 اور ہو۔“

”اس صورت میں بھی ہم آپ کے کام آ سکتے ہیں۔“ فرزانہ بول
 اٹھی۔

”میں کہ چکی ہوں، دروازہ نہیں کھلے گا۔“

”تو کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ آپ ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں
 ہیں، کیونکہ اگر آپ سو گئیں تو صبح سے پہلے تو کیا اٹھیں گی۔ جبکہ
 منصور ساجد کو پچاسی صبح سے پہلے ہی دے دی جائے گی۔“
 ”تم جو بھی سمجھو۔“ روہیتہ بولی۔

”اچھا تو ہم میں سے ایک رحمان صاحب کو بلانے جا رہا ہے،
 کیونکہ انہوں نے تفتیش کے سلسلے میں ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کر رکھا

ہے۔" محمود نے گویا دھمکی دی۔

"ٹھہرو، ہم دروازہ کھولتے ہیں۔ راحیل اثرٹ نے گہرا کر کہا۔
انہوں نے ایک دوسرے کو بھرت بھری نظروں سے دیکھا کیونکہ
ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ دھمکی اتنی کا دگر بھی ثابت ہو
سکتی ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم بھی رحمان صاحب کے پاس نہیں جاتے۔"
محمود نے مسکرا کر کہا۔

اور پھر تقریباً دو منٹ بعد آخر دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے
دیکھا، المادی سے نکالی ہوئی تمام چیزیں دوبارہ المادی میں ٹھوسنی جا
چکی تھیں۔ بات چیت کے دوران گویا وہ یہی کام کرتے رہے تھے۔
"اے یہاں تو آرام کرنے کے کوئی آئٹم نظر نہیں آتے۔" خزانہ
نے چونک کر پردے کمرے کو دیکھا۔ وہاں صرف ایک مسہری بھی تھی۔
اس پر بھی بہتر نہیں کیا گیا تھا۔

"بس ہم ابھی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ راحیل نے فرش
پر سونے کا فیصلہ کیا تھا۔" روبینہ نے جلدی سے کہا۔

"ہمارے آیا جان آپ دونوں کو ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں۔"

انہیں آپ سے چند بہت ہی اہم سوالات کرنے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔" روبینہ نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ پھر وہ راحیل

کی طرف مڑی۔

”آؤ راحیل چلیں۔“

”چلیے جناب“ راحیل نے ان تینوں سے کہا۔

”بسم اللہ کیجیے۔“ محمود نے ہاتھ سے آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ گویا یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ آگے چلیے۔ روبینہ تابش اور راحیل ان سے دو قدم آگے چل پڑے۔ پھر جونہی وہ کمرے سے نکلے، محمود نے دھڑام سے دروازہ بند کر دیا اور تینوں مل کر دروازے پر پھیل پڑے، عین اسی وقت باہر سے دروازے پر دھکا مارا گیا۔ راحیل نے چلا کر کہا:

”یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ راحیل اور روبینہ کا دھکا دروازے کو ہلانے میں ناکام رہا تھا۔ اس حالت سے فائدہ اٹھا کر محمود نے پٹختی لگا دی۔ اس کے بعد وہ چپکٹی آواز میں بولا:

”ہم وہ خط اس کمرے میں تلاش کریں گے جسے تھوڑی دیر

پہلے تک آپ تلاش کرتے رہے ہیں اور اپنے بیان میں یہ مانتے سے

ہی انکاری تھے کہ آپ کسی خط کے بارے میں بات کر رہے تھے۔“

”میں کہتا ہوں، دروازہ کھول دو، ورنہ ہم توڑ دیں گے تم لوگوں

کو کوئی حق نہیں پہنچتا، اس طرح کمرہ بند کر کے تلاشی لینے کا راحیل

چلتا یا۔“

”تھوڑی دیر پہلے آپ دونوں اس خط کے بارے میں سرگوشیاں

کر رہے تھے۔ اور شاید یہ کہ رہے تھے کہ کاش آپ نے اس خط کو پڑھ لیا ہوتا یا یہ کہ رہے تھے کہ پڑھ کر جلا دیا ہوتا، تو ہم اب آپ کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے اس خط کو تلاش کریں گے تاکہ آپ اسے جلا سکیں۔ ویسے کیا آپ اس خط کو پڑھ چکے تھے؟ فاروقی شریف بچے میں کتا چلا گیا۔

”ہاں پڑھ چکے تھے۔ ہم یہ سرگوشیاں نہیں کر رہے تھے کہ کاش اس خط کو ہم پڑھ لیتے، بلکہ ہم یہ کہ رہے تھے کہ کاش اسے پڑھ کر ہم نے جلا دیا ہوتا۔ تو آج ہمیں تم لوگوں کا ذرہ برابر بھی نکر نہ ہوتا۔“

”اس خط میں کیا تھا؟ وہ کس نے لکھا تھا؟“

”یہ ہم نہیں ہرگز نہیں بتائیں گے۔ تم کچھ معلوم نہیں کر سکو گے۔ یہاں تک کہ صبح کے چار بج جائیں گے اور منصور ساجد کو پھانسی دے دی جائے گی۔“

”گویا وہ قاتل نہیں ہے۔“

”وہ قاتل ہے۔ سو فیصد قاتل ہے۔ اس خط کا اس قتل وغیرہ کے سلسلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خط تو اور ہی سلسلے کا ہے۔“
دوبینہ نے وحشیانہ انداز میں چیخ چیخ کر کہا۔

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، پھر رحمان تابش کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

”یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیسا شور ہے، کیا ہنگامہ ہے؟“

اس کی بھری جلدی جلدی اسے صورتِ حال سمجھانے لگی۔

”یہ کس خط کا ذکر ہے؟“ رحمان ہائش کے بچے میں حیرت تھی۔

”کسی خط کا نہیں۔“ رانیل جلدی سے بولا: ”انسپکٹر جمشیہ کے بچوں

کے کان بجتے ہیں، انہیں وہم ہو گیا ہے۔“

”دروازہ کھول دیں بھئی، اگر اس کمرے میں ایسا کوئی خط ہوا تو

ہم اسے آپ سے چھپائیں گے نہیں۔“ رحمان ہائش نے ان تینوں

سے کہا۔ اس دوران وہ کمرے کی تلاشی شروع کر چکے تھے۔

”پہلے اپنی بیگم اور بیٹے سے پوچھ لیں۔ کیا یہ دونوں ہیں وہ

خط دکھانے کے لیے تیار ہیں؟“

”ہیں ان کی ذمے داری ملتا ہوں، یہ آپ لوگوں کے کام میں

فصل نہیں ڈالیں گے۔“

”اچھی بات ہے، اگر آپ یہ وعدہ کرتے ہیں تو ہم دروازہ کھول

دیتے ہیں۔“ محمود نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

”محمود، یہ سب دقتی نہ کرو۔ اس وقت آجا جان میاں نہیں

ہیں۔ یہ لوگ ہمیں ہرگز وہ خط برآمد کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

فاروق بولا۔

”فاروق کا خیال ٹھیک ہے۔ ہم اس وقت تک دروازہ نہیں کھولیں

گے جب تک کہ خط نہ مل جائے اور ہم اسے پڑھ نہ لیں یا پھر آجا جان

یہاں نہ پہنچ جائیں۔ فرزانہ نے اٹل بے میں کہا۔

”ابھی بات ہے، جیسے تم دونوں کی مرضی۔ اب ذرا جلدی جلدی

ہاتھ مارو، غصوں کے ساتھ ساتھ ذہن سے بھی تلاشی لو۔

”ٹھیک ہے؟“ فاروق نے کہا۔ اور انہوں نے اپنی تلاشی

کی رفتار اور تیز کر دی۔

”کیا بات ہے؟“ آپ نے ابھی تک دروازہ نہیں کھولا؟

”ہم نے کھولنے کا پروگرام تو بنایا تھا، لیکن یہ پروگرام کچھ بچا

نہیں۔ اس لیے ہم اپنا پروگرام واپس لیتے ہیں، بالکل اسی طرح

جس طرح بعض لوگ اپنے الفاظ واپس لے لیتے ہیں۔“ فاروق نے

سکڑا کر کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ دھان تابلش نے جھٹکا کر کہا۔

”بات تو واقعی سنیں ہوئی۔ لیکن کیا کیا جائے؟ یہ ایک بے گناہ

کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر ہم چار بجے سے پہلے اُسے بے گناہ ثابت

نہ کر سکے تو ہماری محنت تو اکارت جائے گی ہی، وہ بھی اپنی زندگی

سے جائے گا۔ اور آپ لوگوں کا کچھ نہیں جائے گا۔“ فاروق کس چلا

گیا۔

”ایک ہی جملے میں تم نے تین بار 'جائے گا' استعمال کیا ہے۔“

فرزانہ نے جل کر کہا۔

”سوری، جو بھی دفعہ استعمال نہ کر سکا۔“ فاروق نے سر دماہ بھری۔

تینوں اس وقت تک اس الماری کی تمام چیزیں نکال کر باہر گرا چکے تھے اور اب انہیں ٹوٹل رہے تھے۔ کتابوں کے ایک ایک صفحے کو چیک کر رہے تھے۔

”محمود، میرا خیال ہے، ہم سے بے وقوفی سرزد ہو رہی ہے۔“ اچانک فرزانہ نے چونک کر کہا۔

”یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا؟“

”اس طرح کہ ہمیں یہ تو معلوم ہی نہیں ہے کہ ہم کس قسم کا خط تلاش کر رہے ہیں، وہ کس کے نام ہے، کس نے لکھا ہے؟“ فرزانہ بولی۔

”معلوم ہوتا ہے، آج سناری عقل ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا فوری کے لیے نکل گئی ہے۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”وہ کیسے؟“

”بھئی، اس کمرے میں جو بھی احتیاط سے رکھا ہوا خط مل گیا، میں

وہ وہی خط ہو گا اور اس کا مضمون پڑھ کر تو ہمیں فوراً ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ وہی خط ہے۔“ محمود نے کہا۔

”ارے ہاں واقعی، اس کا مطلب ہے، ہم سے بے وقوفی سرزد

نہیں ہو رہی۔“

”دروازہ توڑ دو، یہ لوگ اس طرح نہیں مانیں گے۔“ اچانک

باہر سے رحمان صاحب کی آواز سنائی دی۔

”میں آپ کا حکم ماننے پر مجبور ہوں جناب۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ حقیقت کو چھپایا نہیں جاسکتا، اگر منظور ہے۔“
 کے مجرم ہونے میں کوئی گڑبڑ ہے تو یہ بات معلوم ہو ہی جانی چاہیے۔“
 راکٹ کی آواز آئی۔

”جکومت، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ خط میری بیگم کی سابقہ زندگی سے متعلق ہو گا، اسی لیے تو یہ اس کے لیے اتنی پریشان ہے۔“

”خیر، جناب میں دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
 ”مسٹر راکٹ، یہ کوشش فضول ہوگی۔ دروازہ اتنا کمزور نہیں ہے اور تم اتنے طاقتور نہیں ہو۔ یونہی اپنا کندھا زخمی کر بیٹھو گے۔ محمود نے نفسیاتی حد کیا۔ اسے خود محسوس ہوا تھا کہ کہیں وہ دروازہ توڑ ہی نہ دے۔“

”میں ان کا حکم ماننے پر مجبور ہوں جناب۔ آخر میں ہر ماہ ان سے تنخواہ لیتا ہوں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے، اچھا بھائی تم اپنا فرض ادا کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔“ فاروق نے مسمی صورت بنا کر کہا۔ پھر ان کی طرف مڑا اور دہلی آواز میں بولا:

”تم دونوں سلاشی جاری رکھو۔ میں دروازے پر رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں تاکہ راکٹ کو دروازہ توڑنے میں زیادہ سے زیادہ دیر لگے۔“ فاروق نے کہا۔

ان کے ہاتھ اور بھی تیزی سے پھلنے لگے۔ ادھر دروازے پر ٹکریں
لگنے لگیں۔ اس عالم میں ابھی تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ رحمان
تلاش کی غصیلی آواز سنائی دی :

”راہیل، کیا تم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟“

”جی نہیں تو ڈیڑی۔“

”تو پھر راکٹ کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ دیکھ نہیں رہے، یہ
اس کے اکیلے کا روگ نہیں ہے۔“

”جی اچھا، میں بھی اس کے ساتھ دروازے پر پل پڑتا ہوں۔
آپ دیکھتے جاسیے، دروازہ کتنی جلدی ٹوٹا ہے۔“

اب بیک وقت دو دو ٹکریں ایک ساتھ دروازے پر پڑنے
لگیں۔ تینوں نے بوکھلا کر ایک دوسرے کی حوت دیکھا۔ دروازے
کے ٹوٹنے کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ جمود اور خزاں کے ہاتھ
بجلی کی طرح حرکت کرنے لگے۔

اور اس کے دو تین منٹ بعد دروازہ دھڑام سے فرش پر آ رہا۔

اے!

”سچ بات تو یہ ہے جناب کہ احسان تابش نے وہ بچہ یتیم خانے سے نہیں لیا تھا۔ یہ راز میں آج صرت اور صرت آپ کو بتا رہا ہوں؛ حالانکہ مجھ سے نہ جانے کتنے لوگوں نے پوچھا۔ کیا کیا لایع نہیں دیے گئے ہجے۔ مگر میں چونکہ قسم کھا چکا تھا اور اُس وقت ایسی صورت حال بھی نہیں تھی۔ اس لیے کسی کو نہیں بتایا کہ احسان تابش صاحب بچے کو کہاں سے لائے تھے۔“ بڑھا رحیم گوگڑا کتا چلا جا رہا تھا اور انپیکٹر جمشید کی صرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، کیونکہ اس وقت تک ان کا اندازہ بھی یہی تھا، وہ بچے کو ضرور یتیم خانے سے لائے ہوں گے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہو رہا تھا۔ انہوں نے سنا، رحیم گوگڑا کہہ رہا تھا:

اپنے بچے کی موت کے بعد احسان تابش بہت اداس رہنے لگے تھے۔ میں ان کی حالت دیکھ کر بہت کڑھتا اور اکثر یہ مشورہ دیتا دہتا کہ آپ یتیم خانے سے کوئی بچہ لے لیں، لیکن وہ ہر بار انگڑیاں سر ہلا

دیتے۔ ایک دن مجھے گھاڑی نکالنے کے لیے کہا۔ تیار ہو کر باہر آئے تو میرے ہاتھ میں ایک کارڈ دیتے ہوئے بولے :
 ”اس پتے پر چلنا ہے لیکن ہمیں اس گھر کا صرف باہر سے جائزہ لینا ہے۔“

”میں نے پتے پر نظر ڈالی۔ یہ امیر لوگوں کی کالونی محسن آباد تھی۔ کارڈ پر لکھے ہوئے پتے کے نزدیک میں بہت آسانی سے پہنچ گیا۔ یہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ انہوں نے اس کوٹھی کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر مجھے واپس چلنے کے لیے کہا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ دوسرے دن دصبح سویرے اس کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ اور کسی قدر دُور بٹ کر سڑک کے کنارے کار رکوالی۔ بہت دیر تک کوٹھی کو تیکتے رہے۔ اچانک اس کے اندرونی دروازے میں سے ایک بچہ نکلا۔ وہ کھیلتا ہوا پھانک تک آگیا۔ اس بچے کو دیکھ کر احسان شاہ صاحب جوش میں آ گئے اور کہنے لگے :

”رحیم ! اس بچے کو اٹھا لو، اس طرح کہ کوئی تمہیں ایسا کرتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔“

”اے آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ میں نے حد درجے خوف زدہ ہو کر کہا۔“

”اس وقت کچھ نہ پوچھو رحیم، جو کہ رہا ہوں وہ کرو۔ یہ وقت باتوں کا نہیں۔ باتیں تو ہم پھر بھی کریں گے۔“

”لیکن آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”میں نے کہا تھا، میں بعد میں بتا دوں گا۔“ انہوں نے ناراض ہو

کر کہا۔

میرا دل نہیں چل رہا تھا کہ نیچے کو اٹھا کر لاؤں، لیکن ان دنوں ملازمتیں بہت مشکل سے ملتی تھیں۔ آخر میں کار سے اُترا اور نیچے کے پیچھے سے جا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اپنی چادر میں چھپا کر کار تک لے آیا۔ نیچے کو اسی طرح چادر میں احسان صاحب کے حوالے کیا اور خود کار چلا دی۔ وہ اس کا منہ دبائے رہے۔ یہاں تک کہ ہم گھر پہنچ گئے۔ یہ بچہ بعد میں مقصور آباد کے نام سے پلا بڑھا۔ بعد میں جب میں نے اس اغوا کا سبب احسان صاحب سے پوچھا تو وہ بولے :

”اپنے ہونٹ سی بوجھیں۔“ اس بارے میں کبھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا، تم بھی میرے ساتھ اس جرم میں شریک ہو چکے ہو۔ اغوا کرتے والے پودہ سال سے کم سنرا نہیں پاتے۔ اگر سنرا کاٹنی ہے تو ضرور اس واقعے کا ذکر کسی سے کر دینا۔“

میں ان کی یہ بات سن کر دھک سے رہ گیا۔ ان کا یہ دُور پہلی مرتبہ میرے سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے ہونٹ واقعی سی لیے۔ کچھ عرصے بعد میری نظر کمزور ہو گئی تو میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔“

یہاں تک کہ کر رحیم داد خاموش ہو گیا۔ انیسویں جشید اب محلے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے اور انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ منظور ساجد کو پھانسی سے نہیں بچا سکیں گے۔ آخر انہوں نے رحیم داد سے کہا :

”کیا آپ مجھے وہ کوٹھی دکھا سکتے ہیں جس سے بچے کو اغوا کیا گیا تھا؟“

”میں صرف دو بار وہاں گیا تھا۔ صرف کالونی کا نام یاد رہ گیا ہے۔“

”ہوں خیر، کوئی بات نہیں۔ اب آپ یہ بات کسی اور کو نہ بتائیے گا۔ دور یہ رکھ لیں، دوا وغیرہ کے کام آئیں گے۔“ انہوں نے جیب سے چند سو روپے کے نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت شکریہ۔ آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں۔“

”ایسا نہ کہیے، میں انسان ہی ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر باہر نکل آئے۔ اب ان کا رخ محسن آباد کے تھانے کی طرف تھا۔ جیب کی رفتار انتہائی تیز تھی۔ محسن آباد کا تھانہ دار انہیں دیکھ کر بوکھلا گیا۔

”یہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ محسن آباد میں آج سے بیس بائیس سال پہلے کوئی اغوا کا کیس ہوا تھا، میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ کس گھر کا بچہ اغوا کیا گیا تھا۔“

”میں چند منٹ کے اندر اندر بتانے کی کوشش کروں گا جناب آپ تشریف رکھیے۔“

یہ کہہ کر وہ اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ تقریباً گیارہ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس کے ساتھ میں ایک ناکل تھی۔ اُن کے سامنے فائل رکھتے ہوئے اُس نے کہا :

”بچہ فیاض سیٹھ کا اعوا کیا گیا تھا۔ ان کا پتا یہ ہے۔“

”اوہ“ انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔ وہ پہلے ہی یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ ضرور فیاض سیٹھ کا ہی بچہ اعوا کیا گیا ہوگا، کیونکہ اس کا روائے کا نام فیاض سیٹھ ہی بتایا گیا تھا، جس کی کار کے نیچے احسان مابش کا بچہ ہلاک ہوا تھا؛ گویا احسان مابش نے انتقام لینے کے لیے فیاض سیٹھ کا بیٹا اس سے چھین لیا تھا اور پھر واپس بھی نہیں کیا تھا۔ اُسے اپنا بیٹا بنا کر پالا تھا۔ اسے باپ کا پیار دیا تھا، یہ ایک عجیب صورت حال تھی۔ انہوں نے تھانے دار کا شکریہ ادا کیا اور کوٹ روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کوٹھی نمبر نو تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ انہوں نے دیکھا۔ یہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ جیپ سے اتر کر انہوں نے پھانک پر لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تقریباً ایک منٹ بعد پھانک کھلا اور ایک بوڑھے آدمی کا چہرہ دکھائی دیا۔

”فرمائیے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”فیاض سیٹھ سے۔“ انہوں نے کہا۔

”میں ہی فیاض سیٹھ ہوں۔“ اس نے کہا۔

انہوں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ حد درجے بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے گال پمپک گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

”میرا نام انیسٹر جیشید ہے۔ میں ایک کیس کی تفتیش کر رہا ہوں اور آپ سے چند سوال کروں گا۔“

”لیکن کسی کیس کی تفتیش سے میرا کیا تعلق؟“

”کوئی تعلق ہے تو یہاں آیا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”بہت اچھا، اندر تشریف لے آئیے۔“

”اس طرح وقت ضائع ہو گا۔ بہتر رہے گا، اگر آپ یہیں

میرے سوالات کے جوابات دے دیں۔“

”لیکن یہ تو بہت غیر اخلاقی بات ہوگی کہ میں آپ کو کھڑا

رکھوں۔“ اس نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں، میں آپ کے گھر آ کر بیٹھوں گا، لیکن کل

کسی وقت۔“

”اچھا خیر، پوچھیے، آپ کیا جانتا چاہتے ہیں۔“

”آج سے تقریباً بائیس سال پہلے آپ کی کار کے نیچے ایک بچہ

”اگر ہلاک ہو گیا تھا۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔ اس طرح یاد ہے، جیسے یہ ابھی کل کی بات ہو، وہ احسان تابش کا بچہ تھا۔ کاش، یہ حادثہ نہ پیش آیا ہوتا۔“ اس نے سر د آہ بھر کر کہا۔

”کیا آپ پر کیس بنا تھا؟“

”ہاں مقدمہ چلا تھا، لیکن جج صاحب نے مجھے بری کر دیا تھا، کیونکہ بچہ اچانک ہی سڑک پر آ گیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”ہوں، آج سے دو سال پہلے ان احسان تابش صاحب کو کسی نے قتل کر دیا تھا، شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہوئے۔“

”نہیں، یہ بات مجھے معلوم نہیں، کیونکہ احسان تابش کے بچے

کے ہلاک ہونے کے بعد مجھ پر بھی قیامت ٹوٹی تھی۔ میرا لڑکا گم

ہو گیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ

اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ سارے شہر میں اُسے تلاش کرایا گیا تھا،

لیکن اس کا کوئی پتا نہ چل سکا تھا۔ اور آج تک میں اس کی

یاد میں رہتا ہوں۔“

”کیا آپ کے اس کے علاوہ اور کوئی بچہ نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں، تین لڑکے اور ایک لڑکی اور ہیں، لیکن وہ میرا

سب سے پہلا بیٹا تھا۔ وہ آج بھی یاد آتا ہے۔ خدا جانے وہ

زندہ بھی ہے یا نہیں، اگر زندہ ہے تو نہ جانے کہاں ہو گا، اس

حالی میں ہو گا۔ بس میں تو دلِ رات یہی سوچتا رہتا ہوں، اس حادثے کے بعد میں ہمارے چلانا چھوڑ دی تھی اور آج تک نہیں چلائی۔ وہ درد بھری آواز میں کہتا چلا گیا۔

”گویا آپ احسان تابش کے قتل کے سلسلے میں کچھ نہیں جانتے؟“
 ”بھلا میں کیا جان سکتا ہوں۔ جس روز سے میرا بیٹا گم ہوا ہے، یہ دینا مجھے اندھیر دکھائی دیتی ہے۔ میں کسی چیز میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔“

”بس مجھے آپ سے یہی سوال کرنا تھا۔ شاید میں کل آپ کو آکر بتاؤں کہ میں یہ سوالات کیوں کرنے آیا تھا۔“
 ”اچھا۔“ اس نے کہا اور الیکٹرک بشید اس سے رخصت ہوئے۔ احسان تابش کی کوٹھی کا رخ کرتے ہوئے ان کا ذہن بُری طرح اُبھا ہوا تھا، کیونکہ اتنا کچھ معلوم کرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگا پاسے تھے کہ منصور ساجد کی بجائے قاتل کون ہے۔ جب وہ کوٹھی میں داخل ہوئے تو، منہوں نے بے ہنگم ماحول دیکھا۔



دردِ اندہ کھلتے ہی وہ سب انداز گھس پڑے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ دیوار کے ساتھ مسمی صورت بنائے کھڑے تھے، پھر فاروق کے

لب بٹ:

”ہمیں دروازے کے نقصان پر بہت افسوس ہے۔ یہ دروازہ صرف ہماری وجہ سے ٹوٹا اور فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ جس خط کی تلاش کے لیے آتا بکھڑا کیا گیا، وہ تو مل ہی نہیں سکا۔“

”کوئی خط ہوتا تو ملتا۔ میں کہتی ہوں، ان تینوں کو دھم پڑ گیا ہے۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ جاسوس لوگ وہی ہوتے ہیں۔“
روبینہ تابش نے جل بہن کر کہا۔

”اس میں تو خیر کوئی شک نہیں، ہوتے تو ہیں وہی ہی۔“
فاروق نے پُر غصہ انداز میں کہہ دیا۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ اس دروازے کی قیمت ہم ان کے والد سے وصول کریں گے۔“ رحمان تابش بولا۔

”یکن جناب، بقول آپ کی بیگم کے، اگر اس کمرے میں کوئی خط موجود ہی نہیں ہے تو آپ لوگوں کو کمرے کا دروازہ توڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ہم اندر کیا کر لیتے۔“

”اس بات کو چھوڑیں۔ اس طرح کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لینا خلاف قانون حرکت تھی۔ آپ یہاں تفتیش کرنے آئے ہیں نہ کہ زبردستی کمرے میں گھسنے اور پھر ان پر قبضہ کرنے۔“

”سوال یہ ہے کہ اگر اس کمرے میں اس کیس سے متعلق کوئی خط نہیں تھا تو راجیل اور ان کی اتنی کیوں کھسکھس کر رہے تھے؟“

یاسین تار نے پہلی مرتبہ اس گفتگو میں دخل دیا۔

”تم چپ رہو تارا۔ تمہارا کوئی کام نہیں ہے بولنے کا۔“
 ”میں کہ چکی ہوں، ہم ایک غیر متعلق خط کے بارے میں باتیں
 کر رہے تھے۔“

”خیر، اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو ہم سے یہ حرکت سہزاد ہو رہی
 چکی ہے۔“

”ہم آپ کے والد سے شکایت ضرور کریں گے۔ راکٹ، وہ کہاں
 گئے ہیں؟“

”جہاں تک میرا خیال ہے، وہ احسان صاحب کے سابق ڈرائیور سے
 ملنے گئے ہیں۔“ راکٹ نے کہا۔

”بھلا اس سے ملنے کی انہیں کیا ضرورت تھی؟ رحمان تابش نے
 حیران ہو کر کہا۔

”یہ تو وہی بن سکیں گے۔“ محمود نے کذبہ اچکائے۔

اسی وقت انہوں نے قدموں کی چاپ سُنی۔ مڑ کر دیکھا تو
 انسپکٹر جمشید چلے آ رہے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

”آپ کے بچوں نے گھر میں اودھم مچا رکھا ہے، آپ یہ ٹوٹا ہوا

دروازہ دیکھ رہے ہیں۔“ رحمان تابش نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

”ارے، یہ انہوں نے توڑا ہے؟“ انسپکٹر جمشید حیرت زدہ لہجے میں

ہوئے۔ اور تینوں کو تیز نظروں سے گھورا۔

”جی نہیں، یہ ہم نے نہیں، انہوں نے توڑا ہے۔“
انہیں ساری بات بتائی گئی۔ انپکٹر جمشید سُن کر تھوڑی دیر خاموش
ہوئے، پھر ہوئے :

”ٹھیک ہے، ہم آپ کا نقصان پورا کریں گے۔ یہ دروازہ
اسنی کی وجہ سے ٹوٹا ہے۔“

ان کے افسانہ سُن کر گھر کے افراد خاموش رہ گئے۔ کسی کے
منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ انپکٹر جمشید تینوں سے ہوئے :
”تم میرے ساتھ آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ جڑے اور ڈرائنگ روم کی
طرف چل پڑے۔

ڈرائنگ روم میں آ کر انہوں نے ان سے کچھ کہنے کی بجائے
انہیں گھورنا شروع کیا۔ تینوں بوکھلا اُٹھے۔

”کیا آپ کے خیال میں ہم نے غلطی کی ہے؟“ فرزانہ نے سہم
کر پوچھا۔

”نہیں، تم نے بہت اچھا کیا ہے۔“ اچانک انپکٹر جمشید مسکرا
پڑے اور ان کے چہرے بھی کھل اُٹھے۔

”بہت بہت شکریہ۔“ محمود بولا۔

”اب وہ خط نکالو۔“ انپکٹر جمشید نے ماتھ آگے بڑھا کر کہا۔

”جی کیا مطلب؟“

”میں جانتا ہوں، تم وہ خط تلاش کر چکے ہو۔“

”آپ۔ آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”میں تمہارے چہروں پر بلا کا اطمینان دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا

کہ تمہیں وہ خط مل گیا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، خط ہم نے ضرور پایا ہے، لیکن ابھی

تک ہم اسے پڑھ کر نہیں دیکھ سکے۔ ہو سکتا ہے، وہ خط واقعی

غیر متعلق ہو۔“ محمود نے کہا۔

”پر دوا نہ کرو، خط دکھاؤ۔“

محمود نے خط نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

انہوں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ساتھ لفافے میں ایک

کاغذ موجود تھا۔ انہوں نے کاغذ نکالنے سے پہلے محمود سے کہا:

”دروازہ بند کر لو۔“

محمود فوراً اٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔ اتنی دیر میں انیکر جمشید

لفافے میں سے کاغذ نکال چکے تھے۔ کاغذ پر ایک مختصر سی تحریر

نظر آئی، جس کے الفاظ یہ تھے:

”مجھے منصور ساجد آہستہ آہستہ ہلاک کرنے کی کوشش

کر رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ مجھے دوسری

دواؤں کے ساتھ خواب آور گولیاں زیادہ مقدار میں

بکھلا دیتا ہے، میں بے سدھ سوتا رہتا ہوں۔ مجھے ڈر

ہے، کہیں وہ مجھے کسی روز اتنی تعداد میں گولیاں نہ بھلا دے کہ میری موت واقع ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو میرا قاتل صرف اور صرف منصور ساجد ہو گا۔ یہ آمیتیں کا سانپ ثابت ہوا۔ میں نے اسے باپ بن کر پالا، لیکن یہ مجھے ہی ڈسنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ میرے قتل کی صورت میں اگر منصور ساجد کو گرفتار کر دیا جائے اور اسے پھانسی کی سزا ہو جائے تو میری روح کو سکون مل جائے گا۔

”احسان تابش“

خط کے الفاظ پڑھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ اس خط نے تو اور بھی منصور ساجد کو قاتل قرار دے دیا تھا۔ اب اسے بچانا تقریباً ناممکن نظر آنے لگا۔ انسپکٹر جمشید کسی گہری سوچی میں گم ہو گئے۔ آخر بولے :

”سوال یہ ہے کہ اس خط کو تو اسی وقت پولیس کے سامنے پیش کر دینا چاہیے تھا۔ روہینہ تابش اور راجیل اشرف کو اسے چھپا کر رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی“ محمود بولا۔

”اس موقع پر میں منصور ساجد سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے لیے مجھے خود ہی جیل تک جانا ہو گا، کیوں کہ

روقت پارکچہ اس وقت تک شاید جا چکے ہوں گے۔

”کیا ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں؟“

”نہیں، تم تینوں کا سیماں ٹھہرنا ضروری ہے۔ انہوں نے

اُٹھتے ہوئے کہا۔

”چلیے یہی بتادیں، آپ منصور ساجد سے کیا سوال کرنا چاہتے

ہیں؟“

”ابھی یہ بھی نہ پوچھو، واپسی پر بتاؤں گا۔ انہوں نے کہا،

اور دروازہ کھولتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔

”یار، یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میرا تو خیال تھا کہ خط حاصل

کرنے کے بعد ہم اصل راز کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔“ محمود

نے ان کے جانے کے بعد کہا۔

”خطا کے الفاظ نے تو مجھے بھی فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔“

فادوق بولا۔

”تو کیا منصور ساجد ہی قاتل ہے۔ اسے پھانسی ہو جائے گی۔“

قرزانہ نے اداس ہنسنے میں کہا۔

”یہ بات میرے حلق سے نہیں اُترتی۔ اس گھر میں سب سے

بلجیب روتیہ روبینہ تہاںش اور اس کے بیٹے کا ہے۔ اگر انہوں نے

کوئی جرم نہیں کیا تو یہ اتنے پُر اسرار کیوں بنے ہوئے ہیں؟“ محمود

نے کہا۔

”ہاں! یہ دونوں واقعی عجیب..... اے۔۔۔۔۔“ فرزانہ اُپھل پڑی۔
 اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
 دوسرے ہی لمحے وہ اُٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔
 دونوں اس کے پیچھے پکے۔ انہوں نے دیکھا، فرزانہ چھت کی طرف جا
 رہی تھی۔

www.pakistanipoint.com

غسلخانے میں

انسپکٹر جمشید ایک بار پھر جیل پہنچے۔ معلوم ہوا، روٹ پارکچہ ابھی تک اپنے دفتر میں موجود ہیں۔ وہ انسپکٹر جمشید کو اس قدر جلد دوبارہ واپس دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

”تو کیا آپ نے منصور صاحب کو بے گناہ ثابت کر دیا؟“
 ”ابھی نہیں، یہ اتنا آسان نہیں۔ عدالت نے اسے یونہی تو مجرم قرار نہیں دے دیا تھا، تمام ثبوت اس کے خلاف تھے۔ تبھی وہ آج پھانسی پانے کا انتظار کر رہا ہے؛ بہر حال میں اس کے لیے سرٹوٹا کو شش کر رہا ہوں، مجھے دراصل اس سے ایک سوال پوچھنا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اب تک یہاں تشریف رکھتے ہیں تو بذریعہ فون بھی کام چلا سکتا تھا۔“

”جس روز ہمیں کسی کو پھانسی دینا ہوتی ہے، اس روز یہاں رات کو بھی کام کرنا پڑتا ہے، تیاری مکمل کرتا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آج تو میں خاص طور پر آپ کے لیے یہاں بیٹھا ہوں؛ ورنہ میں رات

کے دو بچے بھی آ سکتا تھا۔ دراصل میں بہت سیلے پھین ہوں۔ آپ کسی مجرم کے لیے اتنی ٹیگ ورد نہیں کر سکتے۔ آپ کو منصور ساجد کی بے گنہی کا قریب قریب یقین ہے، اتھی تو آپ نے اس کیس پر کام کرنا منظور کیا ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط خیال بالکل غلط ہو اور منصور ساجد واقعی مجرم ہو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔
 ”خیر دیکھا جائے گا۔ ابھی صرف ساڑھے دس بجے ہیں، گویا آپ کے پاس تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے باقی ہیں۔“ روٹ پارکھ نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، اور اس لحاظ سے آپ ذرا جلدی مجھے منصور ساجد تک لے چلیے یا کسی کے ساتھ بھیج دیجیے۔“
 ”نہیں، میں خود ہی چلتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ ایک بار پھر اس کوٹھری کے سامنے کھڑے تھے۔ منصور ساجد اب بھی اسی حال میں نظر آیا۔ یعنی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

”منصور ساجد، اوپر دیکھو۔“

”لک۔ کیا چار بجنے والے ہیں۔ اس کے منہ سے نکلا۔“

”ابھی نہیں، انسپکٹر جمشید تم سے ملنے آئے ہیں۔“

”اوہ۔“ اس نے جلدی سے سر اُپر اٹھایا اور پھر لڑکھانا ہوا۔

دواؤں سے پرہیز کیا گیا۔

”کیا میں بے گن و ثابت ہو گیا ہوں، یہی بات ہے نا جناب،
آپ مجھے یہی خوشخبری سناتے آئے ہیں نا۔“

”تھوڑی دیر اور انتظار کرو منصور، میں کامیابی کے بہت
قرب ہوں۔ تم سے ایک ضروری بات معلوم کرنے آیا ہوں۔“
”ضرور پوچھیے۔“ اس نے مرد آواز میں کہا۔

”کیا احسان صاحب کی موت سے پہلے تمہیں یہ بات معلوم
ہو گئی تھی کہ تم کس کے بیٹے ہو۔“

”نہیں تو، یہ بات تو مجھے اب تک معلوم نہیں۔“ اس نے
حیران ہو کر کہا اور انیکر جیشید کو یقین ہو گیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے،
کیونکہ انہوں نے سوال پر اسی ڈھب سے کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی
انہیں اپنے دل سے ایک بوجھ سا ہٹنا محسوس ہوا، کیونکہ یہ بات
جاننے کے بعد کہ وہ ایک ایسے شخص کا بیٹا ہے، جس کی کار کے
بیٹے احسان تابش کا بیٹا ہلاک ہو گیا تھا اور اس نے انتقاماً اسے
اغوا کیا تھا، وہ احسان تابش کو قتل کرنے کا پروگرام بنا سکتا تھا۔
اور پورے گھر میں سب سے مضبوط وجہ بھی اس کے پاس ہوتی،
لیکن اس صورت میں کہ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کس کا بیٹا ہے،
اس کے پاس صرف دولت حاصل کرنے کی وجہ ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ
وجہ تو گھر کے ہر فرد کے پاس تھی۔

”اور یہ بات تمہیں کب معلوم ہوئی کہ تم احسان تابش کے اپنے بیٹے نہیں، بلکہ بیٹے پالک ہوئے۔“

”یہ بات تو مجھے بچپن میں ہی بتا دی گئی تھی۔ راحیل اشرف اور اس کی ماں بار بار مجھے یہ طعنہ دیا کرتے تھے، لیکن یاسمین ماریا احسان تابش نے کبھی یہ احساس نہیں دلایا۔ اس نے کہا۔“
”ان حالات میں تم خود کو گھر کا ایک فرد تو نہیں خیال کرتے ہو گے۔“

”کیوں نہیں کرتا تھا۔ احسان تابش صاحب مجھے بالکل اپنے بچے کی طرح رکھتے تھے۔ پھر میں راحیل اشرف یا اس کی والدہ کی باتوں کی پروا کیوں کرتا۔“
”اور رحمان تابش کا سلوک تم سے کیسا تھا؟“

”وہ درمیانی راستے پر تھے۔ نہ مجھ سے نفرت کرتے تھے، نہ احسان تابش ایسی محبت۔“

”ہوں، اب تم پھر سے خدا کو یاد کرنا شروع کر دو اور میری کامیابی کے لیے دعا کرو۔ میں چلتا ہوں، انشاء اللہ اس بار تمہاری بے گناہی کا ثبوت لے کر لوٹوں گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو، کیونکہ میں واقعی بے گناہ ہوں۔ اُس نے کہا اور انیکم ہمیشہ وہاں سے ہٹ آئے۔“

وہ دوبارہ کونٹھی میں داخل ہوئے تو محمود، فاروق اور فرناز نہ

ڈرائنگ روم میں نظر آئے، نہ اپنے کمرے میں۔ سونے کے لیے یہی
کے لیے دو کمرے۔ ٹھیک کروا دیے گئے تھے۔ اگرچہ آج
رات انہیں سونا تو تھا ہی نہیں۔



”یہ تمہیں اس طرح یکایک چھت پر آنے کی کیا سوجھی؟“
فادوق نے بھی چھت پر پہنچتے ہوئے دلی آواز میں کہا۔
”تمہیں الٹا ٹکنا ہے، جلد ادھر آؤ۔“
”کدھر آؤں؟ فی الحال میرا الٹا ٹکنا کونئی ارادہ نہیں۔“
”وقت نہ ضائع کرو، جیس دھوکا دیا گیا ہے۔“
”کیا مطلب؟“ فادوق اور محمود ایک ساتھ بول پڑے۔
”ان لوگوں نے جان بوجھ کر کمرے میں کھسکھس شروع کی تھی،
تاکہ ہمارے کان کھڑے ہو جائیں اور اس سے پہلے ہی یہ لوگ یہ
خط لکھ کر الماری میں رکھ چکے تھے۔ پھر انہوں نے خود ہی اس
خط کی تلاش شروع کر دی، جسے بعد میں ہم نے الماری میں سے نکالا۔
میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ یہ خط جعلی ہے اور اسے احسان تابش
نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔“ فرزانہ کشتی چلی گئی۔
”تو پھر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے تو ہیں احسان تابش

کے کمرے میں جا کر ان کی تحریر سے اس خط کی تحریر ملانے کی کوشش کرنا چاہیے تھی — نہ کہ چھت پر آنے کی — آخر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی ؟“ فاروق چمک کر بولا —

”کہ تو چمکی ہوں، تمہیں اس ٹسکا نا ہے، چلو آؤ۔“

”کیا چلو آؤ، چلو آؤ لگا رکھی ہے۔“ فاروق نے منہ بنایا —

”سنو، میرا خیال ہے کہ راحیل اشرف اور روبینہ تالش اپنی اس

کامیابی پر خوش ہے جو رہے ہوں گے۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ میرا

خیال درست ہے یا نہیں — تمہیں ایک بار پھر روشندان تک نکلتا

ہوگا۔ اس طرح ہم منصور ساجد کو بے گناہ ثابت کر سکتے ہیں۔“

”یہ منصور ساجد بھی عجیب سر پھرا آدمی ہے۔“ جب اسے پھانسی

کی سزا سنائی دی گئی تھی تو چپ چاپ چڑھ جاتا پھانسی پر۔ آخر

ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ بلا ڈالا اباجان کو، دھت تیرے کی۔“

فاروق نے جھلاہٹ کے انگلیں چبالتے ہوئے کہا —

”میری جگہ لینے کی کوشش نہ کرو۔“ محمود نے بڑا سا منہ بنایا۔

”یکوں نہ کروں — تم نے آج شام سے اب تک ایک بار بھی

دھت تیرے کی نہیں کہا۔“

”وقت ہی کہاں ملا ہے ؟“

”اب تو جیسے تمہیں وقت ہی وقت مل گیا ہے۔ میں کبھی

ہوں آؤ۔“

اور فاروق کو اسی طرح ٹکنا پڑا؛ لیکن ساتھ داسے کمرے کے روشن دالں پر، یہ کمرہ راجیل اشرف کا تھا۔ راجیل اشرف اور روینہ تائبش کمرے میں ہی تھے۔ لیکن ان کے ساتھ اس وقت رحمان تائبش بھی موجود تھا۔ تینوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے سنا رحمان تائبش کہہ رہا تھا:

”اور یہ بات مجھے آج۔۔۔ الی بعد بتائی جا رہی ہے۔ یہی سچ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”لیکن ہم چندہ بیس لاکھ روپے سے کس طرح ہاتھ دھو لیتے۔۔۔“ روینہ نے تیز لہجے میں کہا۔

”ایک انسانی جان کے مقابلے میں چندہ بیس لاکھ روپے کی کوئی اہمیت نہیں۔“ رحمان تائبش بولا۔

اور فاروق نے ٹانگ ہلا کر محمود اور خزانہ کو اشارہ کر دیا۔ انہوں نے اسے کھینچ لیا۔ اسی وقت انہوں نے انسپکٹر جمشید کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ جلدی جلدی سینچے اترے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ انسپکٹر جمشید کمرے سے نکل رہے تھے۔ فاروق نے جلدی جلدی انہیں ان تینوں کی گفتگو سنا دی۔

”تو کیا احسان تائبش کو روینہ اور اس کے بیٹے راجیل نے ہلاک کیا ہے۔“ وہ بولے۔

”اس کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”لیکن خواب آور گولیوں کی شیشی پر تو صرف منصور ساجد کی انگلیوں کے نشانات تھے۔“

”ابا جان، ایک شیشی سے، اس پر موجود پچھلے سے نشانات کو محفوظ رکھتے ہوئے گولیاں نکالی لینا کیا مشکل ہے۔ انگلیوں پر رومال یا دستانے چڑھا کر ایسا کیا جاسکتا ہے۔“ محمود نے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن اسے لکھ لو کہ تیند لاسنے والی گولیاں احسان تابش، روبینہ یا راجیل کے ہاتھ سے متیں کھا سکتے تھے، یہ کام منصور کے ذمے تھا۔“

”تب پھر آخر آپ اسے بے گناہ کس طرح ثابت کریں گے؟“
”آؤ، دیکھتے ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“

وہ روبینہ تابش کے کمرے کے دروازے پر پہنچے اور دستک دی۔ اندر جیسے یک نخت خاموشی چھا گئی۔ پھر رحمان تابش کی بارعب آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

”میں ہوں انسپکٹر جمشید، اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں سے واپس جانے کی اجازت لینے آیا ہوں۔“

”ارے ہٹھریے، میں دروازہ کھولتا ہوں۔“
دروازہ کھلتے ہی چاروں اندر داخل ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید نے نظر بھر کر ان تینوں کو دیکھا، پھر بولے :
”میں اس کیس میں بُری طرح ناکامی سے دو چار ہوا ہوں،

لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ لوگ کچھ چھپا رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس وقت تک معاملے کی تہ تک پہنچ چکا ہوتا۔“

”ہم کچھ بھی نہیں چھپا رہے، یہ محض آپ کا خیال ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بھائی صاحب کا قاتل منصور ساجد ہی ہے۔“

”تو پھر اس خط کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی جو ان تینوں نے اتنے ہنگامے کے بعد حاصل کیا اور فائدہ پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ اس خط سے تو اور منصور ساجد قاتل ثابت ہوتا ہے۔“

”کیا؟“ رحمان تابش کے ساتھ ساتھ راحیل اور روبینہ بھی چلا آئے۔

”تو آپ لوگوں نے واقعی وہ خط پڑھ کر نہیں دیکھا تھا؟“
 ”جی نہیں، یہ خط ہمیں منصور ساجد کی گرفتاری کے بعد ملا تھا۔ ہم نے اسے مناسب وقت پر پڑھنے کے لیے رکھ دیا اور پھر اس کا خیال ہی نکل گیا۔ دو سال بعد یہ خط ہمیں آج یاد آیا، جب نئے سہ سے معاملے کی کوید شروع ہوئی۔“ روبینہ بولی۔

”ہوں، حیرت ہے کہ آپ میں سے کسی کو بھی اس خط کا خیال نہیں آیا؛ حالانکہ جن دنوں عدالت میں کیس شروع تھا۔ آپ میں سے کسی نہ کسی کو تو ضرور اس خط کا خیال آنا چاہیے تھا۔“
 ”شاید اس لیے خیال نہیں آیا کہ ہم نے اسے پڑھا نہیں تھا۔“

راجیل نے جلدی سے کہا۔

”خیر، بھی ہم مانے بیٹے ہیں۔ لیکن ایک بات مجھے اُنہیں میں مبتلا کر رہی ہے۔ انسپکٹر جمشید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
”وہ کیا ہے؟“ رحمان تابش نے جلدی سے کہا۔

”یہ کہ یہ کافذ جس پر یہ تحریر لکھی گئی ہے، دو سال پرانا نہیں۔ جب کہ لغاف دو سال پرانا ضرور نظر آ رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟“

روبینہ، راجیل اور رحمان تابش کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ ان کے چہروں پر خوف و ڈر گیا۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید نے دوسرا حقد کیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے اس لغافے میں سے اصل خط نکال لیا ہو اور اس کی جگہ یہ خط اپنے ماتھ سے لکھ کر رکھ دیا ہو۔“

”نہیں نہیں۔ یہ غلط ہے۔“ روبینہ چلا اٹھی۔

”اگر یہ غلط ہے تو آپ لوگوں کو اپنی سلامتی دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ انسپکٹر جمشید کی آواز تیز ہو گئی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ انہوں نے یاسمین تمارا کی آواز سنی۔
”مڑ کر دیکھا تو وہ اندر آرہی تھی۔ اس کے پیچھے راکٹ بھی تھا۔ چنڈ سینڈ کے لیے انسپکٹر جمشید کی نظر راکٹ کے چہرے میں اٹک کر رہ گئی۔ ان

کے چہرے پر حیرت کے ہلکے سے آثار نمودار ہوئے اور پھر غائب ہو گئے۔

یاسمین سارا کو مختصر لفظوں میں ساری بات بتائی گئی۔ اس نے فوراً کہا۔

”بہت خوب، پھر تو ان لوگوں کو تلاش کر دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے، آپ ہماری تلاشی لے سکتے ہیں۔“
انسپکٹر جمشید نے ان تبصروں کو اشارہ کیا۔ ان کی تلاشی لی گئی۔ لیکن کوئی خط برآمد نہ ہوا۔ اس کے بعد کمرے کو بھی دیکھا گیا، لیکن ناکامی ہوئی۔

آخر انسپکٹر جمشید بولے :
”محمود ذرا غسل خانے پر بھی ایک نظر ڈال لو۔“

”جی بہتر۔“ اس نے کہا اور غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ فوراً ہی اس کی آواز سنائی دی :
”ابا جان، ذرا ادھر آئیے۔“

اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ انسپکٹر جمشید کے پیچھے عاروق، فرزاد اور یاسمین سارا بھی غسل خانے میں داخل ہو گئے۔ لیکن پہلے سے کمرے میں موجود تین آدمیوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی : البتہ راکٹ مزور دروازے تک چلا آیا تھا، لیکن پھر اندر جگہ

کی کمی محسوس کرتے ہوئے باہر ہی رُک گیا۔

ان کی نظریں فرش پر پڑے ایک چلے ہوئے کاغذ پر جم گئیں
پشتہ لئے بعد انسپکٹر جمشید یہ کہتے ہوئے باہر نکل آئے :
"تم تینوں غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کرو"

www.pakistanipoint.com

بیٹا مل گیا

انہوں نے باہر نکلنے کے بعد ان تینوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا۔ ایک نہایت قیمتی ثبوت کو ضائع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر فون تک پہنچے اور کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ انہوں نے تین جگہ فون کیے۔ آخری فون روکت پارکچہ کو کیا۔ الفا فائیو تھے :

”منصور صاحب بے گناہ ثابت ہو گیا ہے، میں بہت جلد آپ

تک پہنچ رہا ہوں۔“

اس کے بعد وہ پھر اسی کمرے میں آئے اور بولے :

”آپ لوگوں نے یہ اچھا نہیں کیا۔“

یہ کہہ کر پھر باہر نکلے اور کریم بابا کے کوارٹر میں پہنچے۔ چند

منٹ تک اس سے باتیں کرنے کے بعد پھر واپس آئے اور عثمانیہ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ آخر خدا خدا کر کے مستعدہ تھانے سے

پولیس کے آدمی اور ان کے محکمے کے چند ماہرین ایک مجسٹریٹ کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اب انہوں نے غسل خانے کے دروازے پر انگلی بجاتی اور بولے :

”محمود دروازہ کھول دو۔“

دروازہ کھلنے پر انہوں نے ماہرین سے کہا :
 ”اندر ایک جلا ہوا کاغذ پڑا ہے۔ اس کی تصویریں اس قدر احتیاط سے ہیں کہ الفاظ زائل نہ ہوں۔ ابھی الفاظ پڑھے جا رہے ہیں۔“

”جی بہتر۔“

اس کارروائی میں پچند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ماہرین نے فوراً ہی فوٹو تیار کر دیے اور نامکمل تحریر ان کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ انپکٹر جمشید کافی دیر تک اس تحریر پر غور کرتے رہے۔ پھر بولے :

”سب لوگ ایک کمرے میں جمع ہو جائیں اور کریم بابا کو بھی

چارپائی سمیت لے آیا جائے۔“

یہ کام پولیس کے آدمیوں نے کیا۔ تھوڑی دیر بعد سب ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے۔ ان کی نظریں انپکٹر جمشید پر جمی تھیں۔ رحمان، روبینہ اور راحیل کے چہروں پر تاریکی کے بادل صاف نظر آ رہے تھے، جب کہ یاسین تارابے فکر نظر آ رہی تھی۔ چند لمحوں کی

جان بیوا خاموشی کے بعد انپکڑ جمشید نے کنا شروع کیا :

میں یہ واقعہ اس وقت سے شروع کروں گا جب احسان تماش
مرحوم کا بیٹا فیاض سیٹھ کی کار کے نیچے آ کر پکڑا گیا۔ وہ غم سے
پاگل ہو گئے۔ یوں سمجھیے کہ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ پھر اسی عالم
میں وہ ایک دن ایک لڑکے کو آئے۔ گھر کے لوگوں کو اس
لڑکے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا، لیکن میں نے تفتیش کے
بعد یہ بات معلوم کر لی ہے کہ وہ لڑکا دراصل فیاض سیٹھ کا تھا۔
اور احسان تماش مرحوم نے اسے اپنے سابقہ ڈرائیور رحیم گوگر کی مدد
سے اغوا کیا تھا۔ رحیم گوگر زندہ ہے۔ اور اس بات کی تصدیق کرتا
ہے۔ خیر! یہ لڑکا منصور ساجد کے نام سے اس گھر میں پلا بڑھا۔
جوان ہوا۔ احسان صاحب لائے تو اس لڑکے کو انتقام کی نیت
سے سمجھتے، لیکن پھر اس کی محبت میں الجھ گئے اور ایسے اُبھے کہ اُسے
اپنا بیٹا خیال کرنے لگے، لیکن کبھی کبھی انتقام کی آگ انہیں اپنی جگہ
سے ہلا دیتی۔ اور ان کا جی چلنے لگتا کہ منصور ساجد کو قتل کر کے
اپنی انتقام کی آگ بجھائیں، لیکن پھر وہ یہ محسوس کرتے کہ منصور ساجد
ان سے بہت زیادہ طاقت ور ہو چلا ہے، وہ اسے ختم نہیں کر سکیں
گے۔ وہ محبت اور نفرت کے دونوں راستوں پر چلتے رہے۔ ایک
طرف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور دوسری طرف محبت دل میں جڑ
پا رہی تھی۔ انہوں نے اس دوران کئی بار یہ بھی چاہا ہو گا کہ منصور ساجد

کو اس کے ماں باپ کو لوٹا دیں۔ لیکن محبت بھی آڑے آئی ہوگی، اور نفرت بھی۔ ابھی تک وہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔

ادھر انہوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ ان کے گھر کے لوگ ان سے نہیں، ان کی دولت سے محبت کرتے ہیں۔ اس احساس نے انہیں اور بھی بے چین کر دیا، پھر ایک دن وہ مردہ پائے گئے۔ اور ان کے قتل کے الزام میں منصور ساجد کو گرفتار کر لیا گیا۔ مرنے سے پہلے احسان تاملش ایک خط لکھ کر مرے تھے، لیکن وہ خط سب سے پہلے روبینہ تاملش یا ان کے بیٹے نائیل نے دیکھ لیا۔ اور اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں چھپا دیا کہ بعد میں پڑھیں گے۔ پھر اس کا خیال ان کے ذہنوں سے نکل گیا۔ یا انہوں نے جان بوجھ کر اسے نہیں پڑھا۔ پڑھا بھی ہو گا تو پھر اسے چھپا دیا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اسے فوراً ہی ذاتی نہیں کر دیا۔

منصور ساجد کی انگلیوں کے نشانات نیند لانے والی گویوں کی شیشی پر پائے گئے۔ گھر کے زیادہ لوگوں کے بیانات بھی اس کے بالکل خلاف تھے۔ یہ بھی چیز سامنے آئی کہ اسے یتیم خانے وغیرہ سے لے کر پاوا گیا ہے؛ لہذا اس کی نظریں دولت پر تھیں، کیوں کہ احسان تاملش اپنی وصیت لکھوا چکے تھے اور اس میں اس کا حصہ برابر کا تھا؛ لہذا عدالت نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ قتل منصور ساجد

نے ہی کیا ہے۔ ان حالات میں اور اندازہ لگایا بھی کیا جاسکتا تھا؟
 چنانچہ اُسے پھانسی کی سڑا سڑادی گئی۔ صبح اُسے پھانسی دی
 جانے والی تھی۔ اُس سے جب اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو
 اس نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں وہاں گیا تو
 اس نے کہا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں مجھے سچائی نظر
 آئی اور میں نے تفتیش کا فیصلہ کر لیا۔ ہم یہاں آگئے۔ اس کے
 بعد جو ہوا آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے، لیکن یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں،
 جنہیں معلوم نہیں! اِذا ان کے لیے سُناتا ہوں۔

یہ کہہ کر انہوں نے گھر میں پیش آنے والے واقعات کہ سنائے
 اور پھر بولے :-

”ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ اصل خط کی جگہ نقلی خط
 لکھ کر دکھایا گیا۔ اور اصل خط کو جلا کر راکھ کرنے کی کوشش کی
 گئی، لیکن جسے اللہ رکھے، اُسے کون چکھے، یہ لوگ خط کو جلا کر راکھ
 فلش میں نہ بھاسکے کہ میں اور میرے بچے دروازے پر پہنچ گئے۔
 یہاں تک کہ کراسپیکٹ جمشید خاموش ہو گئے۔

”لیکن آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ قاتل کون ہے؟ مجسٹریٹ

نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس کیس میں قاتل کوئی بھی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ کئی آوازیں ابھریں۔ ”یہ سب تو تارا کی آواز ان

سب سے اونچی تھی۔

”جی ہاں، پہلے ہوتے کاغذ پر تحریر کے الفاظ رہ گئے تھے۔ اس طرح حاصل ہونے والی تحریر اگرچہ بے ربط ہے، لیکن پھر بھی مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ احسان تاشی نے اس خط میں لکھا ہے: ’میں محبت، نفرت اور انتقام کی چکیوں کے درمیان پس کر رہ گیا ہوں۔ منصور ساجد اس فیاض سیٹھ کا بیٹا ہے جس کی کار کے نیچے میرا بچہ ہلاک ہوا تھا، میں منصور سے انتقام لینا چاہتا ہوں، لیکن محبت آڑے آئی ہے، ادھر گھر کے افراد میری دولت پر نظریں جماتے بیٹھے ہیں۔ میں دن رات اپنی ہی آگ میں جلتا رہتا ہوں۔ یہ جہنم اب ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے؛ لہذا میں خودکشی کر رہا ہوں۔‘ منصور مجھے خواب آؤد گویاں کھلانے لگے ہی والا ہے۔ میں اس کی آمد سے پہلے ہی چھ سات گویاں مزےں ڈال رہا ہوں۔“

میں ان الفاظ کے بعد خط ختم ہو جاتا ہے۔ یہ خط لکھ کر انہوں نے گویاں کھالیں۔ اسی وقت منصور اندر داخل ہوا اور اس نے معمول کے مطابق شیشی میں سے ایک گولی نکال کر اسٹین کھلا دی اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تاکہ انہیں پکایا نہ جاسکے۔ تو جناب یہ تھی کہانی۔

یہ کیس اسی روز خود کشی کا کیس ثابت ہو جاتا، لیکن روبینہ تابش اور ان کے بیٹے راحیل اشرف کے لالچ نے معاہدے کو اور ہی صورت دے دی۔ اس خط پر سب سے پہلے روبینہ کی نظر پڑی۔ انہوں نے پہلے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ احسان تابش نے خود کشی کر لی ہے اور یہ کہ دوا کی غیثی پر منصور کی انگلیوں کے نشانات ملیں گے، لہذا انہوں نے خط غائب کر دیا۔ اس طرح منصور کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں انہوں نے خط پڑھا، لیکن کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا، یہاں تک کہ اپنے شوہر سے بھی نہیں، دودھ رحمان صاحب منصور پر مقدمہ چھنے دیتے۔ انہوں نے صرف اس کا حصہ ہڑپ کرنے کے لیے یہ اقدام کیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دل ہی دل میں منصور سے نفرت کرتے رہے ہوں، کیونکہ وہ اس گھر کا نہ ہوتے ہوئے بھی گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ یہ کہانی یہاں ختم ہوتی ہے۔ یہ افسوس تک کہانی ہے۔ نہایت افسوس ناک۔

انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ پولیس روبینہ اور اس کے بیٹے کی طرف پڑھنے لگی۔ ان کے چہرے ٹک گئے۔ رحمان تابش ہکا بکا کھڑے رہ گئے۔ یاسمین مارا اب بھی لاپرواہی سے کھڑی تھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پھر جب پولیس ان دونوں کو لے کر نکل گئی، اور رحمان تابش روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تو یاسمین مارا نے انسپکٹر جمشید سے کہا :

” میں منظور کے بیچ جانے پر بہت خوش ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست رہے ہیں اور اب پھر سے دوست بن جائیں گے۔“

کمرے سے نکل کر انیسٹر جشید نے راکٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے :

”انسٹر راکٹ، تمہارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص کے والدین بوڑھے ہو جائیں اور وہ ان کی خدمت نہ کرے وہ بد نصیب ہے۔ جہنم کی آگ اسے جلائے گی۔ اذنا فوراً رحیم گوگڑا کے پاس جاؤ۔ اپنی ماں سے اور اس سے معافی مانگو۔ یہی تمہاری نجات کا راستہ ہے۔“

”اوہ“ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔ راکٹ پوچھا۔

”ہاں“ لیکن مجھے یہ بات تمہارے والد یا والدہ نے نہیں بتائی۔ انہیں تو شاید معلوم بھی نہیں کہ تم کہاں ملازمت کرتے ہو۔ یہ تو میں نے خود ہی اندازہ لگا لیا ہے۔ تمہارے چہرے کے نعوش اپنے باپ سے بہت ملتے ہیں۔“

راکٹ کا چہرہ شرم سے جھک گیا، پھر اس نے کہا :

”ٹھیک ہے، میں جاؤں گا اور انہیں راضی کروں گا۔“

”کیا تم یہاں کوارٹر میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتے ہو؟“ انہوں

نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”تب تم دونوں کے دونوں ان کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔“
اور وہ کوٹھی سے باہر نکلے۔ مجسٹریٹ ان کا انتظار کر رہے
تھے۔ انہیں لے کر وہ کمشنر صاحب کے بنگلے پر پہنچے، انہیں جگایا
گیا۔ ان کا تحریری حکم لے کر وہ جیل پہنچے۔ روٹ پارکچے نے منصور
ساجد کو اپنے دفتر میں بلوا دیا۔

”لو بھئی، انپکڑ جمشید تھادی بے گناہی کا پروانہ لے آئے۔
تھادی آخری خواہش بہت مبراک ثابت ہوئی۔“
منصور ساجد دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔
”ارے، یہ کیا ہوا؟“

”شادی مرگ۔ خوشی برداشت نہیں ہو سکی۔“
تھادی دیر کی کوشش کے بعد اُسے ہوش آ گیا۔ انپکڑ جمشید اُسے
لے کر فیاض سیٹھ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں دو منٹ تک
انتظار کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر فیاض سیٹھ نے دروازہ کھولا۔
”کون ہیں آپ لوگ اور اس وقت کیا کام آ پڑا؟“
”میں انپکڑ جمشید ہوں۔ چند گھنٹے پہلے بھی آیا تھا۔“
”اوہ ہاں، فرمائیے۔“

”آپ کو ایک بہت بڑا تحفہ دینے آیا ہوں۔ اس نوجوان کو
دیکھیے، یہ آپ کا گم شدہ بیٹا ہے۔ اسے احسان سہاشی نے اغوا کر لیا تھا۔“

”یہ۔ یہ۔ یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا۔“ منظور ساجد نے کہا اور آگے

بڑھ کر ان کے گلے سے لگ گیا۔ دونوں رونے لگے۔ انیسٹر جمشید نے مختصر

انعامات میں انہیں ساری بات بتائی اور جب قیام سیٹھ کو یقین آ گیا کہ وہ

خواب نہیں دیکھ رہے تو وہ چلتا ہوا ہوسے اندر کی طرف دوڑے :

”بیگم، بیگم، تمہارا بیٹا مل گیا ہے۔ تمہارا بیٹا مل گیا ہے۔“

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محسود فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیرین

گھر بونقاب پوش

مصنف : اشتیاق احمد

گھر کے تمام دروازے بند تھے۔ بند گھر میں ایک نقاب پوش نمودار ہوا۔ اس نے ایک خاترہ کیا۔ اور گھر سے کامیستر اکھر گیا۔

نقاب پوش گھر کے افراد میں سے ہی ایک تھا۔

لیکن وہ کون تھا اور کیا چاہتا تھا؟ یہ بات کسی طرح معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

فرزانہ کی نقاب پوش سے ٹڈبھڑ، محمود میدان عمل میں، فاروق کی شوخی، عروج پر۔ آخر میں انسپکٹر جمشید راز سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

ایک حیرت انگیز ناول سے

قیمت : ۵۰ روپے